آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے باقاعدہ تصدیق اشاعت

ABC CERTIFIED

انسانی حقوق پر پاکستان کا پہلا جریدہ

# ماہنامہ ہیومن رائٹس کراچی پوسٹ

انسانی حقوق پر پہلی نیوز ایجنسی، حکومت پاکستان سے منظور شدہ

اردو اور انگریزی میں خبروں کی ترسیل

www.hrnww.com hrnww.com/urdu

HUMAN RIGHTS NEWS WORLDWIDE
HRNW
PAKISTAN'S 1ST HUMAN RIGHTS NEWS AGENCY

Regd.SS-No.1260

WWW.HRPOSTPK.COM

## سیاستدانوں کی انا پاکستان کے کروڑوں غریبوں سے زیادہ قیمتی

نئے وزیراعظم فرمارہے تھے کہ قوم 80 ہزارارب روپے کی مقروض ہے اور ایوان کی کارروائی بھی قرض کی رقم سے چلائی جارہی ہے۔ جب وہ یہ تقریر فرمارہے تھے تب ایوان میں ہر ممبر نے خوبصورت اور مہنگا لباس زیب تن کیا ہوا تھا، اسمبلی سے باہر ان کی مہنگی ترین گاڑیاں پارک تھیں۔ 80 ہزارارب کی مقروض قوم کے نمائندوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ووٹ کے ذریعے منتخب ہونے والے بھی لوگ دوسرے کی جیت کو دھاندلی کے ذریعے حاصل کی گئی جیت کا نام دے رہے تھے، دونوں ہی ایک دوسرے کو چور کہہ رہے تھے۔

آپ نے یہ سب کچھ دیکھ لیا، سن لیا، مگر آپ نہیں جانتے کہ اس کارروائی کے دن گلبرگ 3 کے چوراہے پر نہ جانے کتنے ہی مزدور تھے جنہیں روزگار نہیں ملا تھا۔ وہ اس دن کی دیہاڑی کے بغیر گھر جانے والے تھے۔ آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ کراچی میں جلنے والی دکانوں کے دکاندار بہت دنوں سے ایک روپیہ گھر لے کر نہیں گئے۔ کاش اسمبلی میں اس قدر شور کرنے والوں کو ان بچوں کے شور کی آواز بھی سنائی دیتی جنہیں ان کے باپ نے بھوک اور بے روزگاری سے تنگ آ کر قتل کرنے کے بعد خودکشی کر لی۔

اسمبلی میں کراچی کے نمائندے بھی موجود تھے۔ وہ کراچی جہاں روڈ پر ٹریفک کی اس قدر خلاف ورزی ہوتی ہے کہ لگتا ہے یہاں قانون ہے ہی نہیں۔ اگر قانون ہوتا تو پھر اس قدر تجاوزات نہیں ہوتیں، زمین پر فٹ ہاتھ ہوتی جس پر لوگ وحشی ڈرائیوروں سے بچ کر چلتے۔ اسمبلی میں بلوچستان کے نمائندے بھی تھے۔ بلوچستان جس کی ایک بیٹی سخت سردی میں کئی ہفتے دھرنے کے بعد کچھ وعدے لے کر واپس لوٹ گئی۔

اسمبلی میں شور جاری ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ سب اس لیے شور مچارہے ہیں تاکہ ان تک اسمبلی سے باہر بجلی، گیس اور راشن کی بڑھتی قیمتوں سے پریشان لوگوں کا شور نہ پہنچے۔ سب ہی شور مچارہے ہیں۔ 'یہ' بولتے ہیں تو 'وہ' شور مچاتے ہیں۔ 'وہ' بولتے ہیں تو 'یہ' شور مچارہے ہیں۔ اس شور میں غریب کی سسکیاں کون سنے گا؟ بے روزگار کی فریاد کون سنے گا؟ جنہیں مداوا کرنا ہے وہ خود دہائی دے رہے ہیں۔

ن لیگ کا سب سے بڑا مسئلہ میاں نواز شریف کے کیس حل کرانا ہے۔ پیپلز پارٹی کو زرداری کی صدارت چاہیے۔ تحریک انصاف کو عمران کی رہائی چاہیے۔ باقی جماعتوں کو پرکشش وزارتوں کی ضرورت ہے۔ سب اپنے اپنے مفاد کا شور مچارہے ہیں۔ برسوں سے یہ شور تھمنے کا نام نہیں لے رہا۔ 128 دن کے دھرنے کا شور، قادری صاحب کے دھرنے کا شور، جی ٹی روڈ پر 'مجھے کیوں نکالا' کا شور، 9 مئی کو فوجی تنصیبات پر حملہ کرنے والوں کا شور۔ یہ سب شور مچانے والے اب مل کر اسمبلی میں شور مچارہے ہیں۔

میں انتظار کر رہا ہوں کہ یہ شور تھمے تو ان تک سستے راشن کی خریداری کیلیے بنی لائن میں کھڑے سفید پوش لوگوں کا دکھ پہنچاؤں، جو اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کیلیے اپنی تکلیفوں پر شور بھی نہیں مچا سکتے۔ خدا کے واسطے تھوڑی دیر کیلیے یہ شور بند کریں تاکہ آپ تک اس شخص کی آواز پہنچے جو اپنے مکان کا کرایہ ادا نہیں کر پارہا ہے۔ اس ماں کی آواز پہنچے جو اپنے بچوں کی فیس نہیں دے پارہی۔ ان سب بیماروں کی آواز آپ تک پہنچ سکے جو ڈاکٹر کے بجائے میڈیکل اسٹور والے کو بیماری بتا کر اسی کی تجویز کردہ سستی دوا لے لیتے ہیں، کیونکہ وہ ڈاکٹر کی فیس نہیں دے سکتے۔

برائے مہربانی تھوڑی دیر کیلیے ایوان میں خاموشی اختیار کریں تاکہ میں آپ تک یہ بات پہنچا دوں کہ کچھ لوگ دن میں بمشکل صرف ایک وقت ہی روٹی کھاتے ہیں۔ خاموش ہو جائیے تاکہ میں ان ماں باپ کا دکھ بیان کر سکوں جو اپنے بچوں کی شادیاں نہیں کر پا رہے۔ مگر مجھے معلوم ہے آپ خاموش نہیں ہوں گے۔ آپ خاموش ہو بھی نہیں سکتے کیونکہ آپ کی انا پاکستان کے کروڑوں غریبوں سے زیادہ قیمتی ہے۔

## ملک میں سولر پینل

ہماری معاشی مشکلات کا ایک بنیادی سبب بجلی کی مہنگائی ہے۔ گیس اور فرنس آئل سے بننے والی بجلی کے نرخ نیچے لانا ممکن نہیں اور پیداوار کا یہ طریقہ ماحول کی آلودگی کا باعث بھی بنتا ہے جبکہ سورج اور ہوا سے بجلی بنانے کے جدید طریقے ملک میں توانائی کے مسئلہ کا شافی حل ثابت ہو سکتے ہیں۔ شمسی توانائی سولر پینلوں سے حاصل کی جاتی ہے یہ پینل مقامی طور پر اب تک کسی قابل لحاظ تعداد میں نہیں بنائے جارہے لہٰذا انہیں بیرون ملک سے درآمد کیا جاتا ہے۔ یوں اس مد میں خطیر زرمبادلہ بھی خرچ ہوتا ہے اور یہ مہنگے بھی پڑتے ہیں۔ اس تناظر میں وزیر صنعت و تجارت پنجاب چوہدری شافع حسین کی جانب سے پنجاب سرمایہ کاری بورڈ کے دورہ کے موقع پر یہ اعلان کہ سولر پینل فیکٹریوں کو پاکستان میں پلانٹ لگانے کی دعوت دی جائے گی، ایک اہم پیش رفت ہے۔ فاضل وزیر کے مطابق سولر پینل فیکٹریاں پنجاب انڈسٹریل زون میں قائم کی جائیں گے جو دس سال تک ٹیکس فری ہوگا۔ یہ پیشکش صنعتی شعبہ کو اس جانب راغب کرنے میں یقیناً بڑی معاون ثابت ہوگی۔ تاہم ملک میں بننے والے سولر پینلوں کا عالمی معیار کے مطابق ہونا اور غیر ضروری منافع خوری سے پاک رکھا جانا بھی ضروری ہوگا تاکہ رہائشی اور کاروباری مقاصد کیلئے ان کا استعمال بڑے پیمانہ پر کیا جاسکے۔ سستی اور وافر بجلی عام ہو، ہماری زرعی اور صنعتی پیداوار کی لاگت میں کمی آئے اور مہنگائی پر قابو پایا جاسکے۔ ہمارے سینکڑوں میل طویل ساحلی علاقہ جہاں بیشتر اوقات تیز ہوا چلتی ہے، ونڈ انرجی کیلئے مثالی ہیں۔ یہاں ہزاروں ونڈ ٹربائن نصب کر کے ایندھن کے کسی خرچ کے بغیر کئی ہزار میگاواٹ سستی بجلی بنائی اور رہائشی و کاروباری مقاصد کیلئے بہ سہولت استعمال کی جاسکتی ہے۔ سورج اور ہوا جیسی قدرت کی بخشی نعمتوں کے ذریعے سے معاشی ترقی کی راہیں ہمارے لیے کھلی ہوئی ہیں جن سے فائدہ اٹھانے کیلئے صرف درست فیصلوں اور اچھی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

## معاشی بحالی کے عمل کو رکاوٹوں سے پاک رکھا جائے

موجودہ حکومت کو قومی معیشت کی بحالی کے جس قدر اہم اور دشوار چیلنج کا سامنا ہے اس نے کم سے کم ممکنہ مدت کے اندر اس سمت میں نتیجہ خیز پیش رفت کو بلاشبہ وزیراعظم کی اہم ترین ذمہ داری بنا دیا ہے۔ موجودہ حکومتی سیٹ اپ میں معیشت کے حوالہ سے متعدد وزارتیں قائم ہیں جن کی کارکردگی میں ربط اور ہم آہنگی کیلئے ایک مرکزی بندوبست وقت کی بڑی ضرورت ہے اور باخبر ذرائع کے مطابق وزیراعظم کی براہ راست نگرانی میں اس نوعیت کے ایک موثر نظام کی تشکیل کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ آئی ایم ایف پروگرام کے نفاذ کے علاوہ کابینہ ڈویژن ایک خصوصی یونٹ قائم کرنے کی تجویز پر بھی غور کر رہا ہے تاکہ ای سی سی کے فیصلوں کے نفاذ کی نگرانی ہو سکے۔ اس غور و خوض کی روشنی میں بہتر ادارہ جاتی میکنزم کی ضرورت سامنے آئی تاکہ اس ملک کو پائیدار اقتصادی ترقی اور خود انحصاری کی راہ پر ڈالا جاسکے۔ توقع کی جارہی ہے کہ اس تجویز پر عملدرآمد سے ملک کی اقتصادی بحالی کے لیے تمام شراکت داروں اور اہم کھلاڑیوں سے مطلوبہ توجہ مل سکے گی۔ رپورٹ کے مطابق اس مشاورت میں آئی ایم ایف پروگرام کے نفاذ سے متعلق وزیراعظم ہاؤس کا کردار بھی زیر بحث آیا۔ آئی ایم ایف کے ساتھ جاری اسٹینڈ بائی بندوبست چونکہ جلد ہی ختم ہو جائے گا اور حکومت کو آئی ایم ایف سے ایک اور توسیع شدہ سہولت کا پروگرام لینا ہوگا اس لیے یہ تجویز بھی دی گئی ہے کہ اس پروگرام کے نفاذ کی نگرانی کی ذمہ داری بھی وزیراعظم آفس ہی کو تفویض دی جائے۔ معاشی عمل میں نجی شعبہ کی بھرپور شرکت یقیناً خوش آئند نتائج کا سبب بن سکتی ہے۔ حصول آزادی کے بعد تین دہائیوں تک نجی شعبہ کی سرگرم شرکت ہی کی وجہ سے ہماری معاشی ترقی مثالی تھی اور آج کے کئی انتہائی خوشحال ملک اسی ماڈل کو اپنا کر ترقی کے بام عروج پر جا پہنچے لیکن بدقسمتی ہمارے ہاں تمام صنعتوں، بینکوں اور نجی اداروں کو سرکاری تحویل میں لینے کا تجربہ کیا گیا جس

کے تباہ کن نتائج رونما ہوئے۔ ادارے کرپٹ سرکاری مشینری اور حکام کے ہاتھوں برباد ہوگئے اور ہم اب تک خسارہ میں چلنے والے سرکاری اداروں پر عوام کے ٹیکسوں کی خطیر رقوم ضائع کر رہے ہیں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ معاشی بحالی کیلئے سرکاری اخراجات میں آخری حد تک کمی، ٹیکسوں کے دائرہ میں منصفانہ توسیع اور نجکاری سمیت تمام ضروری اقدامات جلد از جلد عمل میں لائے جائیں۔ معاشی بحالی کے عمل کو ہر قسم کی رکاوٹوں اور تنازعات سے پاک رکھا جانا ضروری ہے اور اس کام میں بھرپور تعاون پوری قوم کی ذمہ داری ہے۔ اپوزیشن کو بھی مخالفت برائے مخالفت کے بجائے مہذب ملکوں کی طرح پارلیمان کے اندر اور باہر تعمیری تنقید اور مثبت تجاویز کا راستہ اپنانا چاہیے۔

آئی ایم ایف کو خسارہ میں چلنے والے سرکاری اداروں کی نجکاری کا عمل تیز کرنے کی یقین دہانی قومی معیشت کی بحالی کے حوالہ سے یقیناً ایک امید افزا پیش رفت ہے۔ برسوں بلکہ عشروں سے ان اداروں کی نجکاری کو ناگزیر سمجھا جا رہا ہے لیکن سیاسی نقصان کی وجہ سے کسی حکومت کیلئے اس سمت میں نتیجہ خیز پیش قدمی ممکن نہیں ہوسکی۔ وزارت خزانہ کی گزشتہ سال کی رپورٹ کے مطابق مختلف شعبوں میں 212 قومی تحویل میں لیے گئے ادارے کام کر رہے ہیں جن میں سے 197 ادارے نقصان میں چل رہے ہیں۔ 2016 میں ان اداروں کے نقصانات ملکی جی ڈی پی کا نصف فیصد ہے جو آٹھ برسوں میں تقریباً دس گنا ہو چکے ہیں۔ ان کا سالانہ خسارہ پانچ سو ارب تک پہنچ رہا ہے، اس صورتحال کے پیش نظر وزارت خزانہ کے ذرائع کے مطابق آئی ایم ایف سے جاری مذاکرات میں حکومت نے یقین دہانی کرائی ہے کہ وفاق نے نجکاری کے ذریعے بجلی کی تقسیم کار کمپنیوں کو نجی شعبہ کے سپرد کرنے کا منصوبہ بنالیا ہے، پی آئی اے کی نجکاری کا عمل جلد مکمل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، جبکہ مجموعی طور پر 25 ادارے نجکاری کی فعال فہرست میں شامل ہیں جن کا تعلق مالیات، رئیل اسٹیٹ، صنعت اور توانائی سے ہے۔ اداروں کو سرکاری تحویل میں چلانے کا طریقہ اب تقریباً پوری دنیا میں متروک ہو چکا ہے۔ پاکستان میں بھی پچاس سال پہلے نجی صنعتیں، بینک اور مختلف نوعیت کے کاروبار قومیائے گئے تھے لیکن اس سے معیشت تباہ ہوئی۔ یہ ادارے کرپشن کا گڑھ اور قومی خزانہ پر بوجھ بن گئے تو محدود پیمانہ پر ڈی نیشنلائزیشن کرکے انہیں بحال کیا گیا۔ اس کے باوجود ایسے اداروں کی ایک بڑی تعداد اب بھی قومی وسائل کے زیاں کا سبب بنی ہوئی ہے جبکہ نجی تحویل میں ان کے کامیابی سے چلنے کے امکانات روشن ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ جلد از جلد ان کی نجکاری کا عمل مکمل کرکے معاشی بحالی کی راہ ہموار کی جائے اور اسے سیاسی مسئلہ نہ بنایا جائے۔

## ریکوڈک منصوبہ گیم چینجر

ریکوڈک منصوبہ پر سرمایہ کاری کے حوالہ سے بین الاقوامی گولڈ کمپنی کے اعلیٰ سطحی وفد نے گزشتہ روز وزیراعظم شہباز شریف سے ملاقات کی ہے۔ متذکرہ کمپنی بلوچستان میں واقع سونے اور تانبے کے ذخائر میں دلچسپی رکھتی ہے۔ وفد نے وزیراعظم کو اب تک کی پیشرفت سے آگاہ کیا اور بتایا کہ افرادی قوت کے حصول کیلئے بلوچستان کا ڈومیسائل رکھنے والوں کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ ضلع چاغی میں واقع ریکوڈک نامی قصبہ کا شمار دنیا کے سونے اور تانبہ کے حامل سب سے بڑے ذخائر میں ہوتا ہے۔ ان کی دریافت 1978 میں ہوئی تھی جبکہ منصوبہ کا آغاز 1993 میں ایک امریکی کمپنی کو لائسنس دینے سے ہوا تاہم حکومت بلوچستان کی درخواست پر سپریم کورٹ نے 2013 میں یہ معاہدہ منسوخ کردیا۔ درخواست میں کہا گیا تھا کہ ریکوڈک معاہدہ میں بلوچستان کے لوگوں کا خیال نہیں رکھا گیا۔ سپریم کورٹ کے فیصلہ کو متعلقہ کمپنی نے بین الاقوامی فورم پر چیلنج کیا جس نے 2017 میں حکومت پاکستان کے خلاف کمپنی کو 5.7 ارب ڈالرز ہرجانے کا فیصلہ سنادیا۔ حکومت پاکستان نے 22-2020 میں مختلف فورموں پر اپنا کیس لڑا جس کے نتیجہ میں کینیڈا کی یہ کمپنی پاکستان کے ساتھ معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوگئی، ہرجانے کا فیصلہ واپس لے لیا گیا اور طے پایا کہ اس منصوبہ میں بلوچستان کے 8 ہزار افراد کو روزگار ملے گا ذمہ داریوں کے تحت ریکوڈک کے قریب تین اسکول قائم کیے گئے ہیں اور اب تک ایک سو افراد کو فنی تربیت دی جاچکی ہے۔ وزیراعظم کا کہنا ہے کہ ریکوڈک منصوبہ ملکی معیشت کیلئے گیم چینجر ثابت ہوگا۔ بلوچستان معدنیات کی دولت سے مالا مال ہے جس پر کام کی رفتار تیز کرنے کی ضرورت ہے تاکہ صوبہ کی ترقی اور ملکی معیشت کو سہارا مل سکے۔

## پاک افغان تجارت دونوں ممالک کی اشد ضرورت

پاکستان کی وزارت تجارت کے وفد کا پاک افغان دوطرفہ تجارت میں رونما ہونے والے مسائل پر بات چیت کیلئے دورہ کابل، دونوں ملکوں کے روابط میں در آنے والی سرد مہری کو دور کرکے باہمی تعلقات کو از سر نو خوشگوار بنانے میں امید ہے کہ نہایت معاون ثابت ہوگا۔ پاکستانی وفد دونوں ملکوں کے درمیان سرحدی کراسنگ پوائنٹس پر ٹرانسپورٹروں اور تاجروں کو درپیش رکاوٹوں کو دور کرنے کیلئے مشترکہ اقدامات پر مذاکرات کرے گا۔ اس حوالہ سے افغانستان کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے افغان وزارت تجارت کے ترجمان اخوندزادہ عبدالسلام جواد کا کہنا تھا کہ اسلام آباد کی غیرضروری پابندیوں نے کاروبار کو تقریباً ناممکن بنادیا ہے، انہوں نے انکشاف کیا کہ ایک سال پہلے پاکستان سے یومیہ تقریباً ڈیڑھ سے دو ہزار ٹرک افغانستان میں داخل ہوتے تھے تاہم غیرضروری پابندیوں پر مبنی نئے قوانین نے کاروبار پر نہایت منفی اثر ڈالا ہے جس سے پاکستانی ٹرکوں کی تعداد بمشکل 700 رہ گئی ہے۔ اس صورتحال کو سمجھنے کیلئے پاک افغان تعلقات کے پس منظر کا مختصر جائزہ ضروری ہے۔ صدیوں سے تاریخی، تہذیبی، نسلی، مذہبی اور جغرافیائی رشتوں میں منسلک پاکستان اور افغانستان کے باہمی تعلقات پچھلے چار پانچ عشروں کے دوران مثالی بلندیوں تک پہنچے۔ عشروں طویل مدت میں چالیس پچاس لاکھ افغان مہاجر عملاً پاکستانی قوم کا حصہ بن گئے۔ بیرونی جارحیت کے خلاف مزاحمت کرنے والی افغان تحریک کو پاکستانی عوام کی دلی ہمدردیاں حاصل رہیں۔ پہلی جارحیت کے خلاف افغان مزاحمت کی کامیابی کے بعد تحریک طالبان کی قیادت میں ملک میں ایک مستحکم حکومت قائم ہوئی تو پاکستان اور افغانستان عملاً ایک جان دو قالب بن گئے، نائن الیون کے بعد افغانستان کو دوسری جارحیت کا سامنا کرنا پڑا اور پاکستان کو بھی دہشت گردی کے عفریت کے ہاتھوں بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا تب بھی افغان بھائی بہنوں کے لیے اہل پاکستان کے دلوں میں کوئی تنگی پیدا نہیں ہوئی اور وہ بیرونی جارحیت کے خلاف افغان بھائیوں کی فتح مبین کے آرزومند رہے حتیٰ کہ دو عشروں پر محیط یہ جنگ غیرملکی افواج کی رسوا کن واپسی پر ختم ہوئی اور جارحیت کے خلاف کامیاب مزاحمت کرنے والی تحریک طالبان برسر اقتدار آئی۔ پاکستان کو توقع تھی کہ افغانستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات اب نئی بلندیوں تک پہنچیں گے خصوصاً افغان حکومت اپنی سرزمین کے پاکستان میں دہشت گردی کے لیے استعمال کیے جانے کا فوری اور مکمل خاتمہ کرسکے گی لیکن مسلسل وعدوں اور یقین دہانیوں کے باوجود یہ امید اب تک پوری نہیں ہوئی جس کی وجہ سے حکومت پاکستان کیلئے سخت اقدامات ناگزیر ہوگئے اور دوطرفہ تجارت بھی ان کی وجہ سے متاثر ہوئی۔ امید کی جانی چاہیے کہ پاکستان کے تجارتی وفد کا دورہ کابل اس سمت میں مثبت پیش رفت کا ذریعہ بنے گا۔ پاکستانی وفد افغان بھائیوں کی جائز شکایات پر پوری توجہ دیتے ہوئے ان کے ازالہ کیلئے حکومت پاکستان کو موثر اقدامات تجویز کرے گا۔

# مسلسل تین سالوں سے
# افغانستان متواتر خشک سالی اور سیلاب کا سامنا

**ریفیوجی انٹرنیشنل کے ایک فیلو، قیام الدین اکرام کہتے ہیں،''موسمیاتی تبدیلی ایک سیاسی مسئلہ ہے،لیکن یہ ایک ایسا مسئلہ بھی ہے جس پر سیاست نہیں کی جاسکتی**

طالبان سے بین الاقوام کی بے تعلقی کا مطلب یہ ہے کہ موسمیاتی تبدیلی سے شدید متاثر افغانستان کو تمام بین الاقوامی حلوں تک رسائی سے خارج کر دیا گیا ہے

مسلسل تین سالوں سے، افغانستان متواتر خشک سالی اور سیلاب کا سامنا جنھوں نے موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے شدّت اختیار کر لی ہے۔ اور اس کے باوجود، مسلسل تین سال سے افغانستان اقوام متحدہ کی سالانہ کانفرنس آف دی پارٹیز (سی او پی) سے باہر ہے، جو ماحولیاتی تبدیلیوں سے نمٹنے کے لئے وقف ہے۔

کوپ 28 کا اختتام 13 دسمبر 2023 کو ہوا اور اس میں تقریباً 200 ممالک نے شرکت کی۔ کانفرنس کے قابل ذکر نتائج میں سے ایک، نقصان اور تباہی کے فنڈ کا آغاز تھا، جو موسمیاتی آفات کے شکار ترقی پذیر ممالک کی مدد کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائڈ کے اخراج کے فی کس اعداد و شمار کے مطابق افغانستان کا شمار دنیا میں سب سے کم اخراج والے ممالک میں ہوتا ہے، پھر بھی 2023 میں اسے موسمیاتی تبدیلی کے خطرے کے انڈیکس پر (صومالیہ، جنوبی سوڈان اور یمن کے بعد) چوتھے نمبر پر رکھا گیا۔ اس کے باوجود اگست 2021 میں طالبان کے دوبارہ اقتدار پر آنے کے بعد سے، افغانستان موسمیاتی مسائل پر عالمی مذاکرات سے باہر ہے۔

طالبان کی قیادت میں افغانستان کی فی الحال اقوام متحدہ میں نمائندگی نہیں ہے۔ نومبر 2022 میں کوپ بیورو نے افغانستان کی شرکت سے متعلق فیصلہ موخر کر دیا، جس سے ملک کوپ 28 سے باہر ہو گیا۔ کوپ بیورو کے منتظم یو این فریم ورک کنونشن آن کلائمیٹ چینج نے، اس التوء کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔

بین الاقوامی ایجنسیاں اور عطیہ دہندگان طالبان کے ساتھ شمولیت یا ان کو قانونی حیثیت دینے سے گریزاں ہیں۔ عسکریت پسند گروپ بین الاقوامی دہشت گرد نیٹ ورکس سے روابط کے لئے جانا جاتا ہے اور 2011 سے ان پر اقوام متحدہ کی پابندیاں لاگو ہیں۔ اگست 2021 سے، عالمی بینک سمیت کئی ممالک اور ایجنسیوں نے امداد پر منحصر افغانستان کے لئے مالی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ مارچ 2022 میں طالبان کی جانب سے لڑکیوں کو اسکول جانے پر پابندی کے بعد عالمی بینک نے معطلی کا دوسرا سیٹ نافذ کیا۔ متاثرہ امداد وصول کرنے والوں میں کم از کم 32 موسمیاتی تبدیلی سے موافقت کے منصوبے شامل ہیں۔

موثر حکمت عملی اور منصوبوں پر عمل درآمد کا فقدان

افغانستان میں، موسمیاتی سائنسدانوں اور کارکنوں کو تشویش ہے کہ اس مسلسل بے دخلی سے تیزی سے بڑھتے موسمیاتی جھٹکوں سے نمٹنے کی ملک کی صلاحیت پر سنگین نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ افغان کمیونٹیز کے اندر پیدا ہونے والے بحران پر قابو پانے میں پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہو۔

ریفیوجی انٹرنیشنل کے ایک فیلو، قیام الدین اکرام کہتے ہیں،''موسمیاتی تبدیلی ایک سیاسی مسئلہ ہے، لیکن یہ ایک ایسا مسئلہ بھی ہے جس پر سیاست نہیں کی جاسکتی''۔ وہ جلا وطنی میں رہنے والے چند افغانوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے آزادانہ حیثیت سے کوپ 28 میں شرکت کی۔

افغانستان میں، اکرام موسمیاتی موافقت، ماحولیاتی تحفظ، موسمیاتی انصاف اور تعلیم سے متعلق منصوبوں پر نجی مشیر تھے۔ 2021 سے اکرام، افغانستان واپس آنے سے قاصر ہیں کیونکہ طالبان ناقدین کو پریشان کرتے ہیں، وہ بیرون ملک سے افغانوں کے لئے مہم چلا رہے ہیں جنھیں موسمیاتی تبدیلی کی مدد کی ضرورت ہے۔

اکرام نے دی تھرڈ پول کو بتایا،''ہم ابھی سے لوگوں کے روزگار میں خلل دیکھ رہے ہیں، 80 فیصد سے زیادہ افغان براہ راست یا بالواسطہ طور پر زراعت اور لائیوسٹاک پر انحصار کرتے ہیں۔'' اس کی وجہ سے ''اندرونی نقل مکانی، دیہی علاقوں سے شہروں کی طرف ہجرت، اور بہت سے لوگ سرحدوں سے بھی باہر جا رہے ہیں''۔

اکرام مزید کہتے ہیں،''کئی دہائیوں کے تنازعات نے افغان عوام کی موسمیاتی تبدیلیوں کے اثرات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیتوں کو پہلے ہی ختم کر دیا ہے۔''

سینٹر فار پالیسی ریسرچ کے ایک سینئر وزٹنگ فیلو گوتم مکھوپادھیا کا کہنا ہے کہ ایسے حالات میں پابندیاں ایک غیر مناسب ہتھکنڈا ہیں۔ مکھوپادھیا افغانستان اور میانمار میں ہندوستان کے سابق سفیر بھی ہیں، میانمار کو فروری 2021 میں فوجی بغاوت کے بعد سے کوپ مذاکرات سے خارج کر دیا گیا تھا۔

مکھوپادھیا کہتے ہیں،''اگرچہ پابندیاں کسی نہ کسی طرح کچھ بہتری کے لئے دباؤ کی ایک شکل ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت سے معصوم لوگ بھی اس کا شکار ہوتے ہیں، چاہے اس کی وجہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر امداد کی فراہمی میں کمی ہے یا ترقیاتی فنڈز پر پابندیاں۔ لیکن زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ اب یہ پابندیاں، عالمی اہمیت کی حامل موسمیاتی تبدیلی کے اثرات کو کم کرنے کی کاوشوں میں خلل ڈال رہی ہیں''۔

''ہمیں کسی کو بھی پیچھے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اور خاص طور پر، ان لوگوں کو نہیں جو صرف دوسرے لوگوں کے اخراج کے نتائج بھگت رہے ہیں۔''

افغانستان کا بحران

کوپ 28 کے دوران جب نقصان اور تباہی فنڈز کا آغاز کیا گیا تو افغانستان کی صورتحال پر خاص توجہ دی گئی۔ فی الحال اس فنڈ کو بہت ہی محتاط طریقے

سے وسائل فراہم کئے گئے ہیں۔ اس کا صرف 700 ملین امریکی ڈالر کا پول موسمیاتی آفات سے دو چار ممالک کے لئے درکار تخمینی کل کے 0.2 فیصد سے بھی کم ہے۔ تاہم، بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ حکومت کے بغیر، افغانستان اس تک بھی رسائی کی امید نہیں کر سکتا۔

افغان پانی کے انتظام کے ماہر اور کابل یونیورسٹی کے سابق پروفیسر عاصم مایار پوچھتے ہیں، ''فنڈ کا مقصد ان ممالک تک پہنچنا تھا جو سب سے زیادہ کمزور ہیں، لیکن اگر افغانستان کے لوگوں کو اس سے خارج کر دیا جائے تو اس مقصد کو پورا ہونے کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟''

2021 سے افغانستان بڑے پیمانے پر انسانی بحران سے گزر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی بڑی وجہ طالبان کا قبضہ اور امدادی پابندیاں ہوں، لیکن شدید بحران طویل مدتی خشک سالی کے دور، اور بارش اور برف باری کے نمونوں میں تبدیلی کی وجہ سے ہے۔ اس کی وجہ سے پانی کی قلت پیدا ہوگئی ہے، جس سے کھیتی باڑی پر منحصر ملک میں فاقہ کشی کی نوبت آ گئی ہے۔

اگست 2023 میں شائع ہونے والے اقوام متحدہ کے تخمینے کے مطابق، 29 ملین سے زائد افغان (آبادی کا 68 فیصد) کو زندہ رہنے کے لئے فوری انسانی امداد کی ضرورت ہے۔ جون کے آخر میں، ورلڈ فوڈ پروگرام نے کہا کہ اندازہ ہے کہ مئی اور اکتوبر 2023 کے درمیان کم از کم 15 ملین افغانوں کو خوراک کی شدید عدم تحفظ کا سامنا کرنا پڑے گا۔

سید سمیع اللہ حکیمی دی تھرڈ پول کو بتاتے ہیں، ''اس بحران کی وجہ براہ راست موسم میں ہونے والی تبدیلیوں کو قرار دیا جا سکتا ہے۔'' کابل یونیورسٹی میں زراعت کے پروفیسر، حکیمی طویل عرصے سے کسانوں میں موافقت پیدا کرنے کے لئے سمارٹ ایگریکلچر ٹیکنالوجیز کے استعمال کی وکالت کر رہے ہیں۔ یہ ان چند ماہرین میں سے بھی ہیں جو طالبان کے اقتدار میں واپس آنے کے بعد بھی یہیں موجود ہیں۔

حکیمی کہتے ہیں، ''بڑھتے ہوئے درجہ حرارت کی وجہ سے افغانستان میں گلیشیر پگھلنے لگے ہیں۔ ''1990 اور 2015 کے درمیان کئے گئے سروے کے مطابق، افغانستان کے شمال میں تقریباً 406 مربع کلومیٹر کا برفانی علاقہ ضائع ہو گیا، جس سے پانی کے ذرائع متاثر ہوئے۔''

دریں اثنا، 2017 کے ایک مطالعے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ افغانستان کے دریائی بیسن سکڑ رہے ہیں: کابل، پنج آمو، ہلمند، ہری روڈ-مرغاب اور شمالی دریاؤں کے بیسن کی مجموعی آبی سطح کا حجم 1969 اور 1980 کے درمیان 57 بلین کیوبک میٹر سے کم ہو کر 2007 اور 2016 کے دوران 49 بلین کیوبک میٹر رہ گیا۔ موسم کی بدلتی ہوئی ساخت نے اس مسئلے کو مزید بڑھا دیا ہے۔

حکیمی کہتے ہیں، ''گزشتہ تین دہائیاں زرعی برادریوں کے لئے مشکل رہی ہیں۔

### گنوائے گئے مواقع

اگرچہ حکیمی کوپ 28 میں شرکت کرنے سے قاصر رہے، لیکن اس میں ہونے والی پیشرفت پر انکی گہری نظر رہی۔ کوپ میں افغان نمائندگی نہ دیکھ کر انہیں دکھ ہوا۔

افغانستان میں بڑھتے ہوئے موسمیاتی بحران کی روشنی میں، حکیمی کا کہنا ہے کہ ملک کو مستقبل کی کانفرنسوں سے بے دخل کرنا اس کے لوگوں کے لئے تباہی کا باعث بن سکتا ہے: ''پہلے ہی مشکلات کا شکار ملک نے یہ موقع گنوا دیا۔ نہ صرف ہم افغان کسانوں کی مدد کے لئے سرمایہ کاری کی کوشش نہیں کر سکتے بلکہ بے دخل ہونے کی وجہ سے ہم فوری موافقت کے منصوبوں کو دوبارہ شروع کرنے کے لئے فنڈز بھی حاصل نہیں کر سکتے، جیسے کہ آبی وسائل کا انتظام، ڈیموں کی تعمیر، اس کا افغانستان پر شدید منفی اثر پڑے گا۔''

حکیمی کی مایوسی اکرام کی باتوں سے بھی عیاں تھی، ''کوپ 28 تقریباً ہر ملک یا ایجنسی دوسروں کے ساتھ تعاون کر رہی ہے، علم، ٹیکنالوجی اور وسائل کا اشتراک کر رہی ہے تاکہ موسمیاتی تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہو سکے۔ لیکن افغانستان کو ہر موقع پر سائیڈ لائن کیا گیا۔ یہ بہت افسوسناک تھا۔''

اکرام کا کہنا ہے کہ انہوں نے کوپ 28 کے ہر ایونٹ میں افغانستان کا ذکر کیا جس میں انہیں خطاب کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ اس میں ایک ایونٹ ''ایڈوانسنگ کوآپریشن آن اسائلم اینڈ مائیگریشن'' شامل تھا، جو یورپی کمیشن کے زیر اہتمام موسمیاتی نقل مکانی پر ایک ضمنی پینل تھا۔ اکرام نے شریک ماہرین تعلیم اور طلبہ کو وارننگ دی، ''موسمیاتی تبدیلی سے متعلقہ آفات سرحدوں تک محدود نہیں ہیں۔ اگر افغانستان انسانی بحران کا سامنا کر رہا ہے تو یہ خطے میں پھیلے گا، جس سے نقل مکانی، سیاسی عدم استحکام اور عدم تحفظ جنم لیں گے۔''

کوپ 28 کے دوران کارروائیوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے، دی تھرڈ پول نے صرف افغانوں میں افغانستان سے متعلق مسائل کے لئے حقیقی جوش و خروش دیکھا۔

افغانستان کی انوکھی صورت حال یکساں طور پر اختراعی طریقوں کی متقاضی ہے۔ ان میں سے کئی طالبان کو بائی پاس کرتے ہیں، جسے زیادہ تر حکومتیں نادانستہ طور پر بھی جائز نہیں بنانا چاہتیں۔ ''افغانستان میں اقوام متحدہ اور بین الاقوامی ادارے کام کر رہے ہیں جو ضرورت مند مقامی کمیونٹیوں کو فنڈنگ اور وسائل فراہم کرنے میں مدد کر سکتے ہیں،'' اکرام کہتے ہیں، ''موافقت کے منصوبوں کو دوبارہ شروع کرنے سے متعلق کچھ فوری مسائل کو مقامی تنظیموں کے ساتھ مل کر حل کیا جا سکتا ہے۔''

مایار اس بات سے اتفاق کرتے ہیں،'' طالبان سے پہلے بھی، ایسے منصوبوں کے لئے براہ راست فنڈ حاصل کرنے کے لئے کوئی تسلیم شدہ سرکاری ادارہ نہیں تھا۔ یہ اقوام متحدہ کی ایجنسیاں تھیں جنہوں نے افغان حکومت کے ساتھ مل کر پروپوزل بنانے اور افغانستان کے اندر موافقت کے فنڈز لانے کے عمل میں ثالثی کی۔''

طالبان سے پہلے، گرین کلائمیٹ فنڈ کو تمام افغان درخواستیں، افغان سرکاری ایجنسی کے ساتھ شراکت دار ایک بین الاقوامی ایجنسی کے ذریعے جمع کرائی جاتی تھیں۔ مایار کا کہنا ہے کہ اقوام متحدہ ایک بار پھر افغانوں کی مدد کے لیے فنڈز فراہم کر سکتا ہے۔ تاہم، اب اس کے ساتھ شراکت کے لئے کوئی سرکاری ادارہ نہیں ہے۔

کوپ 28 کے آغاز میں جاری کردہ ایک بیان میں، یونائیٹڈ نیشنز اسسٹنس مشن ان افغانستان (یو این اے ایم اے) نے اعتراف کیا کہ اس وقت تک کی کوششیں ناکافی تھیں۔ ''انسانی امداد میں کمی ہوتی جا رہی ہے، اور آب و ہوا کی مالی اعانت بڑی حد تک معطل ہے۔''

یو این اے ایم اے نے یہ بھی کہا کہ عالمی ماحولیاتی فورم سے افغان آوازیں غائب ہیں اور ڈی فیکٹو طالبان حکومت اس میں دلچسپی رکھنے کے باوجود بین الاقوامی حمایت کے لیے سازگار پالیسی یا گورننس ابھی تک قائم نہیں کر سکی۔

حکیمی کا کہنا ہے کہ بینکنگ پر پابندیوں میں بھی نرمی کی ضرورت ہے،''اس وقت، افغانستان میں کام کرنے کی خواہش مند تنظیموں کو بینکنگ پر پابندیوں کی وجہ سے بہت سی مشکلات کا سامنا ہے۔ میں عطیہ دہندگان حکومتوں اور ایجنسیوں کو یہ بھی مشورہ دوں گا کہ وہ نئی راہیں تلاش کرنے پر غور کریں، جیسے کہ اقوام متحدہ یا بین الاقوامی این جی اوز کے ساتھ کام کرنا جو مقامی این جی اوز کو ترقیاتی منصوبوں پر کام کرنے کے لئے فنڈز کی تقسیم میں سہولت فراہم کر سکتے ہیں۔''

مایار کہتے ہیں،'' یہ ان ترقی یافتہ ممالک کا عزم تھا کہ وہ دنیا کی کمزور آبادیوں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ''اس مقصد کے حصول کے لئے میکانزم موجود ہیں، انھیں اسے کرنے کے طریقے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔''

جیسا کہ یو این اے ایم اے نے یکم دسمبر کو کہا، ''افغانستان موسمیاتی تبدیلی پر آواز اٹھائے بغیر ایک اور سال نہیں گزر سکتا۔''

(روچی کمار کی یہ رپورٹ دی تھرڈ پول پر شائع ہو چکی ہے۔

# پاکستان میں لڑکیوں کی شادی کی کم از کم عمر؟ کم عمری کی شادی پر سزا؟

## یونیسف کے مطابق کون سے صوبہ میں کم عمری کی جبری شادی کی شرح سب سے زیادہ ہے

## ہیومن رائٹس میڈیا نیٹ ورک کی چشم کشا رپورٹ

ندیم احمد ایڈووکیٹ

کم عمری کی شادی پاکستان میں اور خاص کر دیہی علاقوں میں رواج بن چکی ہے، دیہی علاقوں میں اس لعنت کی سب سے زیادہ شرح صوبہ سندھ میں ہے یہ رواج غیر متناسب طور پر لڑکیوں کو متاثر کرتا ہے۔یونیسیف کی2018 کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں تقریباً18 فیصد لڑکیوں کی شادی18 سال کی عمر سے پہلے کر دی جاتی ہے جو کہ سری لنکا کے بعد جنوبی ایشیا میں کم عمری کی شادیوں کی بڑی شرح ہے۔کم عمری کی شادی اکثر دیہی علاقوں میں ہوتی ہے اور کم آمدنی والے گھرانوں میں جہاں تعلیم بہت کم ہے، اس کی بنیادی وجہ غربت بھی ہے۔

کم عمری کی شادی پر پابندی کے حوالے سے سب سے پہلے چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ 28 ستمبر 1928 کو انڈیا کی امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں پاس ہوا، اور یہ باقاعدہ قانون یکم اکتوبر1929 کو بنا، اس قانون نے لڑکیوں کی شادی کی عمر14 سال اور لڑکوں کی 18 سال مقرر کی۔1949 میں، برصغیر کی آزادی کے بعد، اس میں ترمیم کر کے لڑکیوں کے لیے 15، اور بعد ازاں1978؟ میں لڑکیوں کے لیے18 اور لڑکوں کے لیے 21 کر دیا گیا۔

اس قانون میں دی گئی عمر سے کم عمر بچوں کی شادی پر سزا ایک ماہ قید یا ایک ہزار روپے جرمانہ یا دونوں سزائیں شامل تھیں۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد بھی یہ قانون برائے نام موجود رہا اور قانون پر عمل درآمد اور ان میں سزاؤں کی شرح پر کبھی غور ہی نہیں کیا گیا۔

چونکہ پاکستان میں کم عمری کی شادیاں زیادہ تر دیہی علاقوں میں سر انجام پاتی تھیں اور بہت سی شادیاں ایسی بھی ہوتی تھیں جو قتل کے بدلے یعنی قصاص کے طور پر کروائی جاتی تھیں اور اس نظام کو چلانے والے علاقے کے سردار، وڈیرے اور جاگیردار ہوتے تھے، جو پارلیمنٹ میں بھی اپنے علاقوں کی نمائندگی کرتے تھے،اس لئے انہوں نے کبھی بھی اس قانون کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں ہونے دی۔

وقت گزرنے کے ساتھ جب میڈیا کے ذریعے ایسے واقعات سامنے آتے گئے،تو پھر بیرون دنیا کو دکھانے کے لئے اس ملک کے پالیسی سازوں نے پہلے2016 میں قومی اسمبلی میں؟ بل پیش کئے جانے کا مسودہ تیار کیا جس میں چائلڈ میرج ریسٹرینٹ کی چند شقوں میں تبدیلی لائی گئی اور یہ شقیں خاص کر سزاؤں سے متعلق تھیں لیکن چونکہ یہ قانون اس ملک کے وڈیرہ اور سردار پر مشتمل پارلیمنٹرین کی رٹ کا چیلنج کرتا تھا اس لئے اسے دونوں ایوانوں سے پاس کر کے قانون بنانے میں بھی کسی نے دلچسپی نہیں دکھائی۔

بہرکیف !2019؟ میں سینیٹ سے یہ ترمیمات منظور ہو کر ترمیمی قانون چائلڈ ریسٹرینٹ ایکٹ 2019 بن گیا،ان میں جو خاص ردوبدل کیا گیا وہ صرف شق نمبر5 میں دی گئی سزاؤں سے متعلق تھا جس میں جرم کی سزا ایک ماہ سے بڑھا کر زیادہ سے زیادہ تین سال اور کم از دو سال رکھی گئی جبکہ جرمانہ کی شرح ایک ہزار سے بڑھا کر زیادہ سے زیادہ دو لاکھ اور کم از کم ایک لاکھ کی گئی۔

ان جرائم کو سنجیدہ ہی نہیں ؟لیا گیا اور یہ جرائم قابل ضمانت دفعات قرار دیئے گئے کیونکہ تعزیر پاکستان کے قانون میں تین سال تک کی سزا کے تمام جرائم ویسے ہی قابل ضمانت ہوتے ہیں،

چونکہ یونیسیف کی رپورٹ میں کم عمری کی شادیوں کی لعنت سب سے زیادہ سندھ میں قرار دی گئی اس لئے سندھ حکومت نے اس حوالے سے صوبائی سطح پر سندھ چائلٹ میرجز ایکٹ2013 کا مسودہ تیار کیا گیا جسے28 اپریل2014 کو سندھ اسمبلی نے منظور کر لیا اور گورنر سندھ نے 10 جون 2014 کو اس کی توثیق کر کے اسے صوبائی قانون کی شکل دے دی۔

یہ ایکٹ بھی دراصل قومی سطح پر چائلڈ ریسٹرینٹ ایکٹ کا چربہ قرار دیا جا سکتا ہے، اور اس میں سزائیں بھی وہی رکھی گئی ہیں جو2019 کی وفاقی ترمیم میں مقرر کی گئی تھیں۔ اور اس میں مرد یا عورت دونوں کی18 سال سے کم عمری کی شادی کو جرم قرار دیا گیا ہے۔سندھ چائلڈ میرجیز ایکٹ میں البتہ اس جرم کو قابل تعزیز اور نا قابل ضمانت قرار دیا گیا ہے۔اور یہ جرائم نا قابل مصالحت یعنی نا قابل راضی نامہ بھی قرار دیئے گئے ہیں۔

طریقہ کار:

ضابطہ کے سیکشن190 میں موجود کسی بھی چیز کے باوجود،

فرسٹ کلاس جوڈیشل مجسٹریٹ کی عدالت کے علاوہ کوئی دوسری عدالت یہ کیس نہیں چلائے گی

اس ایکٹ کی خلاف ورزی میں یعنی مقررہ عمر کی حد سے کم اگر کوئی شادی ہونے جا رہی ہے تو عدالت درخواست پر حکم امتناعی یعنی اسٹے آرڈر جاری کرے گی اور جو بھی فریق اس حکم امتناعی کی خلاف ورزی کرے گا اسے الگ سے ایک سال قید اور

جرمانہ کی سزا بھگتنا ہوگی۔

عدالت اس معاملے میں جب نوٹس جاری کرے تو تمام فریقین کو عدالت کے روبرو ذاتی یا اپنے وکیل کے ہمراہ صفائی کا حق فراہم کیا جائے گا۔ اور عدالت کو یہ کارروائی 90 دنوں میں مکمل کر کے فیصلہ صادر کرنے کی مہلت دی گئی ہے۔

سندھ چائلڈ میرجیز ریسٹرینٹ ایکٹ میں کم عمر بچی سے شادی کرنے والے کو تین سال قید اور جرمانہ کی سزا کا مستوجب قرار دیا گیا ہے تو اس کے سہولت کاروں یعنی ماں باپ خواہ وہ لڑکی کے ہی کیوں نہ ہوں، نکاح خواہ اور اس نکاح کے دیگر سہولت کاروں کو بھی جرم ثابت ہونے پر یہی سزائیں دی جائیں گی۔

کم عمری کی شادی کے پس منظر میں دیکھا جائے تو غربت، ناخواندگی، انسانی حقوق مخالف سماجی اور ثقافتی طرز عمل اس کے عوامل ہیں۔

کم عمری کی شادی کے پھیلاؤ کے مضمرات اور اس کے بعد اس کم عمر ماں کا حمل، بالآخر نوعمر لڑکی کی صحت کو متاثر کرتا ہے۔ عام طور پر بچے پیدا کرنے کے لیے دلہنوں پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا جاتا ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں، 15 اور 18 سال کی عمر کے درمیان نوجوان لڑکیوں کی موت کی سب سے بڑی وجہ جلد حمل قرار دیا گیا ہے۔ کم عمری کی شادی کے حوالے سے قانون تو اپنی جگہ موجود ہے لیکن جب تک دیہی علاقوں میں جاگیرداروں، وڈیروں اور سرداروں کا نظام چلتا رہے گا اس وقت تک ان جرائم پر رپورٹ کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوگا اور رپورٹ اگر کہیں سے ہو بھی جاتی ہے تو یہی جاگیردار، وڈیرے اور سردار اسمبلیوں میں براجمان ہیں جو اپنے اپنے علاقوں میں اپنی رٹ کو چیلنج کرنے والوں کو تو نشان عبرت بنا دیتے ہیں لیکن قانون پر عمل درآمد نہیں ہونے دیتے، یہی وجہ ہے کہ آج تک کوئی ایسا قابل ذکر کیس سامنے نہیں آ سکا ہے جس میں کم عمری کی شادی کے ذمہ داروں کو قرار واقعی سزا ملی ہو، ہمارے ملک میں بھی ایسے قوانین اور ترمیمات محض عالمی تنظیموں اور ترقی یافتہ ممالک کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور اس بہانے غیر ملکی امداد حاصل کرنے اور پھر انہیں ہضم کرنے کی غرض سے بنائے جاتے ہیں اور یہ صرف کاغذوں میں زندہ رہتے ہیں، عملی طور پر ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔

بہ تعاون
انٹرنیشنل کمیشن آن ہیومن رائٹس

# پاکستان میں اب تک کم عمری کی شادیوں کا رواج کیوں؟

پاکستان کے مغربی صوبے بلوچستان میں ایک پانچ سالہ بچی کی شادی نے بچوں کے تحفظ اور خاندانی معاملات میں قدامت پسند مذہبی شخصیات کے کردار پر بحث چھیڑ دی ہے۔

اکتوبر میں پاکستان کے صوبے بلوچستان میں پولیس نے اطلاع ملنے پر دو افراد کو اس وقت گرفتار کیا، جب انہوں نے ایک پانچ سالہ بچی کی زبردستی شادی کروائی۔ لڑکی کے چچا کا کہنا ہے کہ ایک مقامی فرد نے اپنے بیٹے کی شادی کے لیے بچی کے رشتے پر اصرار کیا اور لڑکی کے والد پر شادی کے لیے دباؤ ڈالا گیا تھا۔

انہوں نے بتایا، "ہم نے بارہا ان کو سمجھایا تھا کہ لڑکی شادی کرنے کے لیے ابھی کم عمر ہے''۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس 'وٹہ سٹہ کی شادی' کی ویڈیو ریکارڈنگ کی گئی اور پھر پولیس کو مطلع کیا گیا۔

مقامی پولیس چیف نے بتایا کہ پولیس نے شادی کے انتظامات کرنے والے ذمہ داروں کو گرفتار کر لیا ہے اور مقدمہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ وہ اس نکاح خواں کی گرفتاری کے لیے کوشش کر رہے ہیں، جس نے یہ نکاح پڑھایا۔

تاہم پاکستان میں یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں۔ اقوام متحدہ کے ادارہ برائے اطفال یونیسیف کے مطابق پاکستان میں تقریبا 19 ملین کم عمر دلہنیں موجود ہیں۔ اس ادارے کے ایک اندازے کے مطابق تقریبا 4.6 ملین بچیوں کی شادی 15 سال کی عمر سے پہلے کر دی گئی جبکہ 18.9 ملین بچیوں کی شادیاں 18 سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی کر دی گئیں۔

پاکستان کے قبائلی علاقے، کم عمری کی شادی کا رجحان

لاہور میں مقیم ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان سے تعلق رکھنے والی طاہرہ حبیب نے بتایا کہ 2022ء میں کم عمری کی شادی کے 99 واقعات رپورٹ ہوئے۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ یہ تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے کیوں کہ ایسے خاندانوں کو بدنامی کا خوف ہوتا ہے۔

طاہرہ حبیب کے مطابق پاکستان کے قبائلی علاقوں میں کم عمری کی شادیوں کے سب سے زیادہ واقعات پیش آتے ہیں۔

بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ سے تعلق رکھنے والی سابق قانون ساز یاسمین لہری نے بتایا کہ صوبے کے قبائلی اور دیہی علاقوں میں لڑکیوں کی شادیاں تقریبا 18 سال کی عمر سے پہلے ہی کر دی جاتی ہیں، "شہری علاقوں میں آگاہی ہونے کے سبب لڑکیوں کی شادی 18 سال یا اس سے زائد عمر میں کی جاتی ہے لیکن صوبے کے باقی حصوں میں صورتحال کافی سنگین ہے''۔

ان کا کہنا ہے کہ غربت اور معاشی عوامل اس معاملے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اکثر کم عمر لڑکیوں کی وٹہ سٹہ کی شادی خاندانوں کے درمیان اس لیے طے پاتی ہے کہ ان نوجوان بچیوں سے گھر کا کام کاج یا مزدوری کرائی جا سکے۔

شادی کی کم از کم عمر کی حد مقرر کرنے پر مذہبی جماعتوں کی مخالفت

پورے پاکستان میں سول سوسائٹی کم عمری کی شادیوں کے خاتمے اور سخت قانون سازی کے لیے سرگرم ہے۔ اس حوالے سے وہ اس رویے کی تبدیلی کے لیے مذہبی جماعتوں، حکومت اور مختلف برادریوں کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہے۔

پاکستانی قانون ساز کشور زہرہ کا کہنا ہے کہ شادی کی کم از کم حد مقرر کرنے کی قانون سازی میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہبی طبقہ ہے۔

انہوں نے بتایا کہ جب اس حوالے سے بل قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا تو مذہبی سوچ رکھنے والے ممبران نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق سربراہ مولانا شیرانی شادی کی کم از کم حد مقرر کیے جانے والی قانون سازی کی پرزور مخالفت کرتے ہیں۔ کونسل نے حکومت کو مشورہ دیا ہیکہ قانون سازی اسلام کے مطابق کی جائے۔

کونسل نے 2014ء میں کم عمری کی شادیوں کو روکنے کے قانون کو 'غیر اسلامی' قرار دیا، جس کی وجہ سے میڈیا اور سول سوسائٹی کی جانب سے تشویش کا اظہار کیا گیا۔

سابق قانون دان یاسمین لہری نے بتایا کہ جب شادی کی کم از کم حد مقرر کرنے کا بل بلوچستان اسمبلی میں پیش کیا گیا تو مذہبی جماعتوں کی جانب سے اس کی شدید مخالفت کی گئی۔

سابق قانون ساز سمیعہ راحیل قاضی کہتی ہیں کہ لڑکیوں کی شادی کی کم از کم عمر کی حد 18 سال ہونی چاہیے۔ مغربی اقدار کی وکالت کرنے اور مذہب کو مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے اس مسئلہ کے جڑ سے خاتمے کے لیے ایک بڑی اور موثر آگاہی مہم کی ضرورت ہے۔

# عالمی یوم خواتین

## عورت مارچ! صنفی مساوات کا نعرہ

**خواتین اپنے خلاف ہونے والے ہر ظلم وزیادتی پر آواز اٹھانے کا پورا حق رکھتی ہیں۔ خواتین اپنی روزمرہ زندگی میں کثیرالجہتی کردار ادا کرتی ہیں۔**

سحرحسن/ راضیہ سید

معاشرے کی ترقی کا راز خواتین کو بھرپور انداز سے قومی دھارے میں شامل کرنے میں مضمر ہے۔ خواتین کو بااختیار بنانے کے بہت سے دعوے ہم دن رات سنتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔

اکیسویں صدی میں بھی ہم خواتین کی ترقی کو لے کر بہت پیچھے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے صرف زبانی کلامی ہی سب کام کیے ہیں، دل سے خواتین کو بااختیار بنانے کے متعلق کبھی نہیں سوچا۔

آج خواتین بلاشبہ ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہیں لیکن خواتین کی ترقی استحصال کے ساتھ ہو رہی ہے۔ ہر انسان اب تک اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ خواتین اپنے حقوق کیلیے مسلسل جدوجہد کر رہی ہیں اور مردوں کے مقابلے میں انھیں اپنا آپ منوانے کیلیے کئی گنا تگ ودو کرنا پڑ رہی ہے تو یہ غلط نہیں۔

ہر عورت کو ہر نئے دن ایک نئے محاذ کا سامنا ہے۔ عورت اگر بیٹی، بیوی، بہن ہے تو صرف اسی پر یکطرفہ ذمے داریاں عائد کر دی گئی ہیں۔ عورت اگر خاتون خانہ ہے تو اس کے گھریلو امور میں مصروف رہنے کو کوئی کام ہی نہیں گردانتا اور اگر ملازمت پیشہ ہے اور قابل بھی تو وہاں بھی ایک نئی جنگ اس کی منتظر ہے۔

ملازمت میں ترقی کو اس کی شخصیت یا خوبصورتی سے جوڑ دینا بہت ہی آسان کلیہ بنا دیا گیا ہے۔ کردار کشی، جنسی اور آن لائن ہراسانی آج کی دنیا کا وتیرہ بن گیا ہے۔ اگرچہ میں تمام افراد کی بات نہیں کر رہی لیکن ہمارے معاشرے کی اکثریت خواتین کو مردوں کے مساوی تو کیا انسان سمجھنے کے بھی قائل نہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خواتین کا عالمی دن منانے سے اس کے تمام تر حقوق پورے ہو جاتے ہیں؟ ایسا ہرگز نہیں! دیکھا جائے تو ہر دن عورت کا ہے۔ اس ماں کا دن ہے جو سارا دن کام کاج کرتی ہے، اپنے بچوں کا خیال رکھتی ہے۔ ہر دن اس بہن کا ہے جو جب بھی باہر نکلتی ہے اپنے باپ اور بھائی کی غیرت کا مان بن کر نکلتی ہے۔ ہر دن اس بیوی کا ہے جو گھریلو کام کاج کے ساتھ ملازمت کر کے اپنے شوہر کے شانہ بشانہ زندگی کی گاڑی چلا رہی ہے۔

پاکستان کے قانون وارثت کی دفعہ چار سو اٹھانوے اے کے مطابق بیوہ اور کنواری تمام خواتین کو جائیداد کے حقوق دیے گئے ہیں لیکن قوانین کی موجودگی سے مراد یہ نہیں کہ ان قوانین کا اطلاق بھی یقینی بنایا جا رہا ہے۔ آج کے اس مہذب معاشرے میں مائیں بیٹوں کو اب تک اپنے سروں کا تاج سمجھتی ہیں، بچیوں کو شروع سے ہی یہ سکھایا جاتا ہے کہ تمھارا اصل گھر تمھارے شوہر کا گھر ہے، تو شروع سے ہی وہ مہمانوں کی طرح اپنے گھر میں رہتی ہیں۔ اور ایک طرح سے انھیں یہی سمجھا دیا جاتا ہے کہ گویا یہ بھائیوں کا ہی گھر ہے، تم اپنے حصے سے متعلق کوئی امید یا توقع مت رکھنا۔

پاکستان کے وراثتی قوانین کے مطابق خاتون کی چاہے شادی ہو یا نہ ہو، وہ بھائیوں کی موجودگی میں جائیداد کے آدھے حصے کی وارث ہے۔ اسی طرح اگر ایک بیوہ عورت شوہر کے مرنے کے بعد دوسری شادی کرتی ہے تو وہ بھی ناقابل واپسی جائیداد کی مالک ہے۔ کنواری اور بیوہ دونوں خواتین وراثت میں ملنے والی جائیداد فروخت بھی کر سکتی ہیں۔

لیکن اس سب کی باوجود خواتین ساری زندگی کورٹ کچہری کے چکر ہی لگاتی رہتی ہیں اور ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔

ہیومن رائٹس کمیشن کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ہر دو گھنٹے میں ایک ریپ کا کیس

سامنے آرہا ہے جبکہ ہر آٹھ گھنٹے کے بعد ایک اجتماعی زیادتی کا اندوہناک سانحہ پیش آرہا ہے۔ اب کچھ بات اگر عورت مارچ کے حوالے سے ہوجائے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ عورت مارچ نے خواتین کے حقوق دلانے کے بجائے خواتین کے اصل مسائل سے پہلوتہی کی ہے۔ عورت مارچ کے نام نہاد لبرل ازم کے نعروں کی گونج نے خواتین کو حقوق تو نہیں دلائے بلکہ لایعنی و بے مقصد اور قابل مذمت ایشوز کو ضرور جنم دے دیا ہے۔

سڑکوں پر پلے کارڈز اٹھائی گنتی کی چند خواتین نوے فیصد خواتین کی نمائندگی نہیں کرتیں اور نہ ہی نوے فیصد خواتین یہ جانتی ہیں کہ یہ نام نہاد نعرے ان کے مسائل ہیں۔

صنفی تفریق کے باعث روشن خیالی کا پیکر نظر آنے والے سماج میں بھی خواتین کا شمار کمزور طبقات میں ہوتا ہے۔ اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا بھر میں ہر تین میں سے ایک عورت کسی نہ کسی قسم کے تشدد کا شکار ضرور ہوتی ہے۔ جنوبی ایشیا کے ممالک میں یہ تناسب سب سے زیادہ ہے۔

دنیا کے بیشتر ممالک کی طرح ہمارے یہاں بھی خواتین کو مختلف طرح کے تشدد کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے اور، بہت سی خواتین سماجی لعن طعن کے ڈر سے خود پر ہونے والے ظلم و جبر کے خلاف آواز بھی نہیں اٹھا پاتی ہیں۔ خواتین کو ہراساں کرنے، مارنے پیٹنے، زدوکوب کرنے کے واقعات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ اچھرہ بازار میں خاتون کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ اس کی تازہ مثال ہے۔ ہمارے سماج میں عورتوں پر تشدد کی سب سے بڑی وجہ ہمارا مخصوص سماجی ڈھانچہ ہے جو عورتوں کو صنفی مساوات کا حق دینے سے انکار کرتا ہے۔ طاقت کے بل بوتے پر کمزور طبقے کی حق تلفی روز کا معمول ہے۔

ہمارا معاشرہ دراصل مجموعی طور پر قبائلی اور جاگیردارانہ سوچ کے شکنجے میں قید ہے۔ سماجی تفریق کا چلن عام ہے۔ عورتوں کو کمزور طبقہ سمجھا جاتا ہے۔ ہر سطح پر ان کی آواز کو دبایا جاتا ہے۔ گھر کے اہم فیصلوں میں انہیں شامل نہیں کیا جاتا۔ گھر اور باہر قدم قدم پر انہیں روک ٹوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کی شخصیت سے اعتماد چھین لیا جاتا ہے تاکہ عورتیں تمام عمر مردوں کی غلام (باندی) و محکوم بنی رہیں اور مرد ان پر حکومت کرتے رہیں۔

ہمارے یہاں بہت سے عورت مخالف رسم و رواج پرانے زمانے سے رائج ہیں جو عورتوں کو ذہنی کرب سے دوچار کیے رکھتے ہیں۔ زرعی سماج میں عورتیں اب بھی مال مویشیوں کے زمرے میں آتی ہیں۔ بعض اوقات انہیں خاندانی دشمنیاں نمٹانے کیلیے ہرجانے کے طور پر مخالفین کے سپرد کردیا جاتا ہے۔ اسی طرح کم عمری کی جبری شادیاں، پرانے وقتوں کے مطابق حق مہر لکھوانا، وٹہ سٹہ، بیوی کی رائے لیے بغیر زبردستی کے اسقاطِ حمل، جہیز نہ ملنے کی صورت میں بیویوں کے اعضا بیچ دینا، غیرت کے نام پر قتل ''کاروکاری''، ونی، سوارہ، قرآن سے شادی وغیرہ بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

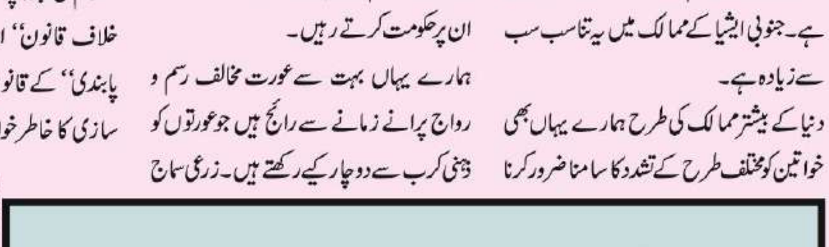


پاکستان میں عورتوں کے مساوی حقوق کیلیے وقتاً فوقتاً قانون سازی بھی کی جاتی ہے، جن میں ''کام کی جگہ پر عورتوں کو ہراساں کرنے کے خلاف قانون'' اور ''عورت دشمن روایات پر پابندی'' کے قانون قابل ذکر ہیں۔ مگر قانون سازی کا خاطر خواہ فائدہ عام عورتوں کو نہیں پہنچ پاتا۔ قانون پر عمل درآمد میں اکثر پیچیدگیاں آڑے آجاتی ہیں۔ طاقتور دندناتے پھرتے ہیں اور کمزور طبقہ انصاف کیلیے روتا اور سسکتا رہ جاتا ہے۔

خواتین کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ انہیں زندگی کے ہر معاملے میں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اکثر قبائلی نظام میں بسنے والی دیہی اور شہری عورتیں اب بھی دورِ جاہلیت کی گھسی پٹی روایات کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ وہ صبح سے رات گئے تک گھر اور باہر جبری مشقت کرتی ہیں۔ گھر، شوہر اور بچوں کی سیکڑوں ذمے داریاں تن تنہا نبھاتی ہیں۔ چوبیس گھنٹے بلامعاوضہ نوکری کرتی ہیں، ساتھ ہی کھیتوں میں کام کرتی ہیں، مال مویشی پالتی ہیں، سلائی کڑھائی کرتی ہیں، فیکٹریوں اور دفاتر میں بھی کام کرتی ہیں اور گھر کی کفالت میں اپنا حصہ ڈالتی ہیں مگر ان کی یہ تمام تر خاموش محنت مشقت کام کے زمرے میں نہیں آتی۔ ان کی تمام تر خدمات کا صلہ گھر کے مرد لے جاتے ہیں۔

عورتوں کو وراثت کا حق نہیں دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات گھر کے سرپرست جائیداد تقسیم ہوجانے کے خوف سے اپنی بہنوں، بیٹیوں کی شادیاں نہیں کرواتے، یوں شادی کی عمر گزر جاتی ہے۔ ان کے بالوں میں چاندی اتر آتی ہے اور وہ بوڑھی ہوکر اس دنیا سے رخصت ہوجاتی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے سماج میں خواتین کا استحصال بچپن سے ہی شروع ہوجاتا ہے۔ کم عمری میں وہ اپنی ماؤں کو آخر میں کھانا کھاتے دیکھتی ہیں۔ بیٹوں کی خوراک کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ صنفی امتیاز عمر کے مختلف ادوار میں گھر اور باہر ہر جگہ برتا جاتا ہے۔ وہ اگر پڑھنا چاہتی ہیں تو ان کی تعلیم پر توجہ دینا والدین کی پہلی ترجیح نہیں ہوتی۔ ماں باپ یہی کہتے ہیں کہ تمھیں پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے، کل شادی ہوکر پرائے گھر چلی جاؤ گی، ہمیں تم سے کون سی نوکری کروانی ہے، پڑھ لکھ کر بھی ہانڈی چولہا ہی کرنا ہے۔ اگر وہ پڑھ لکھ جاتی ہیں تو ملازمت کرنے سے روکا جاتا ہے۔ اگر میرٹ پر ملازمت مل بھی جائے تو وہاں اکثر پسند ناپسند کی وجہ سے ان کی زندگی تنگ کردی جاتی ہے۔ غیر موافق ماحول ان کے کام کرنے کی جگہ پر رکاوٹیں کھڑی کردیتا ہے۔ مل مزدور اور

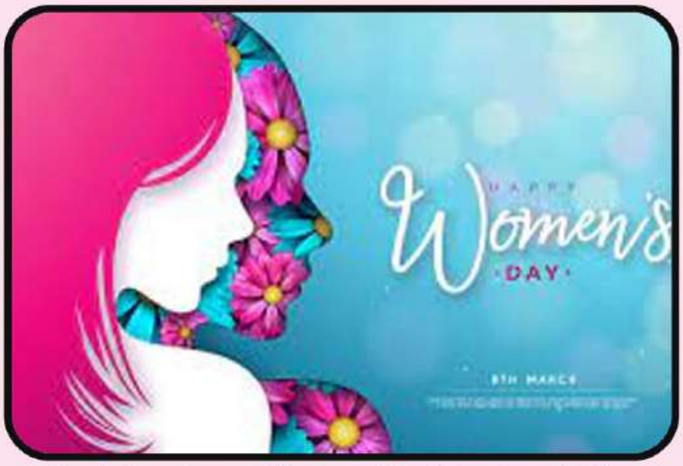


دفاتر میں نوکری کرنے والی عورتوں کو جوائننگ لیٹر اور جاب سیکیورٹی نہیں دی جاتی۔ انہیں جب چاہیں کام سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس طرح ملازمت پیشہ عورتیں اپنے بہت سے حقوق سے محروم رہ جاتی ہیں۔

چند برسوں سے خواتین کے عالمی دن کی مناسبت سے منعقد ہونے والے ''عورت مارچ'' پر شدید واویلا مچایا جا رہا ہے۔ حالاں کہ ہمارے ہاں ہر جگہ عورتوں کا استحصال روز کا معمول ہے۔ اس ضمن میں خواتین اپنے خلاف ہونے والے ہر ظلم و زیادتی پر آواز اٹھانے کا پورا حق رکھتی ہیں۔ عورتوں کے حقوق، تحفظ و ترقی کیلیے سرگرم ادارے بھی پاکستان میں عورتوں کی مجموعی صورت حال سے مطمئن نظر نہیں آتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عورتوں کے ساتھ زیادتیاں ہو رہی ہیں، ریاست انہیں تحفظ فراہم نہیں کر رہی ہے۔ ان کے مفاد

میں بنائے گئے قوانین پر عمل درا?مد نہیں ہوتا ہے۔ انتظامیہ، عدلیہ اور پولیس اس سلسلے میں اپنا مؤثر کردار ادا نہیں کر پا رہے ہیں۔ سو عورت مارچ صنفی برابری کا ایک مزاحمتی نعرہ بن گیا ہے اور اب یہ نعرہ ایک مزاحمتی تحریک کا روپ دھار چکا ہے۔

ذرا سوچیے! عورتیں بھی انسان ہیں۔ وہ بھی زندگی جینے کیلیے ایک آزاد فرد جتنی آزادی چاہتی ہیں۔ وہ بھی سماجی و معاشی سطح پر برابری کے حقوق چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ صنف کی بنیاد پر قدم قدم پر ان کا سماجی و معاشی استحصال نہ کیا جائے تا کہ وہ بھی امن و سکون کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

خواتین کے مسائل میں ناخواندگی، بے روزگاری، کاروکاری، وراثتی حقوق سے محرومی، کم عمری کی شادی اور جبری نکاح جیسے مسائل شامل ہیں۔ لیکن ان کا ذکر عورت مارچ کے بینرز میں کہیں نہیں ہوتا۔

اس ایک دن کے ڈھونگ کا کیا فائدہ؟ ہمارے ڈرامے ہیں تو وہاں خواتین کا استحصال دکھایا جاتا ہے۔ طلاق، تھپڑ اور غیر ازدواجی تعلقات ہمارے پورے ڈراموں میں یہی کہانی ہوتی ہے۔ سوال تو یہ بھی ہے کہ ہماری نوے فیصد خواتین جو ڈرامہ دیکھ رہی ہیں وہ کیا سیکھ رہی ہیں؟ کیا ان ڈراموں میں خواتین کے حقیقی مسائل کی طرف نشان دہی کی گئی ہے؟ یقینی طور پر نہیں۔

اس سب صورتحال کا ذمے دار کون ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میں، ا?پ اور ہم سب۔ کیونکہ ہم سب مل کر ہی یہ معاشرہ بنا رہے ہیں۔ چاہے ہم ادیب ہیں یا شاعر، ڈاکٹر یا انجینئر، استاد یا بالفرض ہمارا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبے سے ہو، ہمارے ہر عمل کا براہ راست اثر اس معاشرے پر پڑتا ہے۔ ا?ج اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ خواتین کو معاشرے میں وہ عزت اور مقام نہیں مل رہا جس کی وہ مستحق ہے تو اس میں ہم سب کی گھریلو تربیت بھی کہیں نہ کہیں ضرور اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔

ہمیں اپنی عورت کو اگر با اختیار بنانا ہے تو سب سے پہلے ایک عورت کو ہی بطور ماں ایک مرد یعنی بیٹے کی تربیت کرنا ہوگی۔ بہترین خانگی تربیت کی وجہ سے ہی ہم ترقی کی منازل طے کر سکتے ہیں۔

انسانی وجود کے پیچیدہ نقش میں خواتین طویل عرصے سے بغیر کسی رکاوٹ کے مختلف کرداروں کے درمیان خوب صورتی، لچک اور عزم کے ساتھ خود کو ڈھالتی رہی ہیں۔ بچوں کی پرورش کرنے سے لے کر پیشہ ورانہ ذمے داریوں تک، مختلف امور کی دیکھ بھال سے لے کر رہنما کا کردار نبھانے تک خواتین اپنی روزمرہ کی زندگی میں متعدد ذمے داریاں نبھاتی ہیں اور ان کے ہر کردار کے ساتھ اپنے اپنے مسائل اور کامیابیاں جڑی ہوئی ہیں۔ خواتین کے مختلف کرداروں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ان کی انتھک کوششوں کو تسلیم کیا جائے اور معاشرے میں ان کی بے مثل خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا جائے۔

پرورش اور دیکھ بھال

خواتین کے بہت سے کرداروں میں پرورش اور دیکھ بھال کرنے والے کردار کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ ماں، بیٹی، بہن یا دوست کے روپ میں خواتین اکثر اپنے پیاروں اور عزیزوں کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمے داری اٹھاتی ہیں۔ گھر کا کوئی بھی کام لیجیے، صبح پو پھٹے سے ا?دھی رات تک یہ گھر کے بڑوں اور بچوں کی راحت اور اچھی صحت کی خاطر خود کو مشکل میں ڈالے رکھتی ہیں۔ یہ کردار جذباتی اور جسمانی نگہداشت دونوں پر محیط ہے، جس میں صبر، ہم دردی، ایثار اور بے لوثی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ذاتی خواہشات کے ساتھ دیکھ بھال کے فرائض کو متوازن کرنا مشکل ہوسکتا ہے۔ یہ سماجی توقع کہ خواتین کو اپنی ضروریات پر نگہداشت کو ترجیح دینی چاہیے، احساسِ جرم، کم زوری اور احساسِ

شکست کا باعث بن سکتی ہے۔ مزید برآں! مناسب سہارے اور وسائل کی کمی اس کردار میں خواتین کو درپیش مسائل بڑھا سکتی ہے۔

تاہم! دوسری طرف خواتین اپنی نگہداشت کے کردار میں جو محبت اور ہمدردی شامل کرتی ہیں، وہ بے پایاں ہے۔ محفوظ اور پروان چڑھانے والے ماحول پیدا کرنے کی ان کی صلاحیت ایسے بندھنوں کو فروغ دیتی ہے جو مضبوط خاندانوں اور معاشروں کی بنیاد ہے۔

### پیشہ ورانہ طرزِ زندگی

دورِ حاضر میں خواتین رکاوٹوں کو توڑ کر مختلف پیشہ ورانہ شعبوں میں مخالف جنس پر سبقت لے رہی ہیں۔ کمرہ؟ جماعت سے لے کر جلسہ گاہ تک، سائنسی تجربہ گاہوں سے لے کر عدالتوں میں منصفی تک، جراحی سے لے کر خلاؤں پر راج کرنے تک خواتین متنوع شعبوں میں دقیانوسی تصورات کو ختم کرتے ہوئے اور مختلف امور میں جدت کے ساتھ نمایاں پیش رفت کر رہی ہیں۔

خواتین کو اپنے پیشہ ورانہ کاموں میں اکثر صنفی تعصب، غیر مساوی مواقع اور چادر اور چار دیواری کے عدم تحفظ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حقوق نسواں اور خاندانی ذمے داریوں کی معاشرتی توقعات کے ساتھ پیشہ ورانہ مستقبل کی خواہشات کو متوازن کرنا خواتین کیلیے اہم مسائل کا باعث بن سکتا ہے۔ نیز کام کی جگہ کے مختلف محرکات سے احسن انداز میں نمٹنے اور مساوی سلوک کے حصول کو یقینی بنانے کیلیے لچک اور عزم کی ضرورت ہوتی ہے۔

خواتین اپنی پیشہ ورانہ کوششوں میں جس عزم، ذہانت اور استقامت کا مظاہرہ کرتی ہیں وہ قابلِ تعریف ہے۔ مختلف سرگرمیوں میں ان کی شراکتیں نہ صرف کام کی جگہوں کو تقویت دیتی ہیں بلکہ خواتین کی آنے والی نسلوں کیلیے بغیر کسی پابندی کے اپنے خوابوں کو آگے بڑھانے کی راہ بھی ہموار کرتی ہیں۔

### معاشروں کیلیے رہنما اور تبدیلی کی سفیر

خواتین دنیا بھر میں سماجی تبدیلی اور کمیونٹی کی ترقی کے اقدامات کو چلانے میں سب سے آگے ہیں۔ چاہے نچلی سطح پر سرگرمی، تحریک یا غیر منافع بخش اور سول سوسائٹی کی تنظیموں میں قائدانہ کردار کے ذریعے خواتین اپنی برادریوں میں مثبت تبدیلی کیلیے عامل ہیں۔ کمیونٹی اور سیاسی تنظیموں میں شرکت کر کے وہ صنفی مساوات، خواتین کے حقوق اور خواتین کی صحت کے مسائل کے حوالے سے معاشرے کو آ؟ گاہ کرتی ہیں۔

ان کی اہم شراکت کے باوجود، قیادت کے کردار میں خواتین کو اکثر شکوک و شبہات، مزاحمت اور صنفی بنیاد پر امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پیچیدہ قوتوں کے محرکات کو چلاتے ہوئے معاشرتی دقیانوسی تصورات اور تعصّبات پر قابو پانے کیلیے بے پناہ ہمت اور لچک کی ضرورت ہوتی ہے۔ جوش اور لگن والی خواتین اپنے کردار کو کمیونٹی رہنما کے طور پر امید کی تحریک اور تبدیلی کو ہوا دیتی ہیں۔ سماجی انصاف اور مساوات کیلیے ان کی غیر متزلزل وابستگی سب کی شمولیت اور خوش حال معاشرے کو فروغ دیتی ہے۔

### خانگی امور اور مالیاتی ذمے داریاں

اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کے علاوہ خواتین اکثر گھریلو ذمے داریوں جیسے کھانا پکانا، صفائی ستھرائی اور گھریلو معاشیات کو سنبھالتی ہیں۔ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کے مشکل تقاضوں کے باوجود زیادہ تر خواتین گھر واپس آنے پر اپنے خاندانوں کی فلاح و بہبود اور راحت کو یقینی بناتے ہوئے بغیر کسی رکاوٹ کے گھریلو کردار ادا کرتی ہیں۔ شام کو تھکے ہارے واپس گھر پہنچ کر وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے بجائے بغیر کسی وقفے کے گھریلو ذمے داریوں کی تکمیل میں لگ جاتی ہیں۔

گھریلو فرائض کے ساتھ پیشہ ورانہ ذمے داریوں کو متوازن کرنا بہت زیادہ دشوار ہوسکتا ہے۔ خواتین اکثر اپنے مستقبل کی خواہشات کے تعاقب کے دوران گھر کے مالیاتی انتظام، گھر کی دیکھ بھال، اور اپنے پیاروں کی فلاح و بہبود کو یقینی بنانے کی کوششوں میں خود کو وقف کر دیتی ہیں۔

خواتین پیشہ ورانہ اور گھریلو ذمے داریوں کو نبھانے میں جس لگن اور لچک کا مظاہرہ کرتی ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ اپنی ذمے داریوں میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھر میں محبت، اپنائیت اور ہم آہنگی کا ماحول پیدا کرنے کی صلاحیت ان کی طاقت اور عزم کی عکاسی کرتی ہے۔

خواتین اپنی روزمرہ کی زندگی میں جو کثیر الجہتی کردار ادا کرتی ہیں ان میں لچک، قوت، خوبی اور ہمدردی شامل ہے۔ خواتین کی حوصلہ افزائی اور ان کی انمول شراکت کو تسلیم کر کے ہم ترقی کو تیز کر سکتے ہیں اور سب کیلیے مساوی اور جامع معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ آیئے! ہم خواتین کے تنوع اور کامیابیوں کا جشن منائیں، ایک ایسے مستقبل کی طرف کوشاں ہوں جہاں ان کی آواز سنی جائے، ان کے حقوق کا احترام کیا جائے اور ان کی صلاحیتوں کا پوری طرح ادراک ہو۔

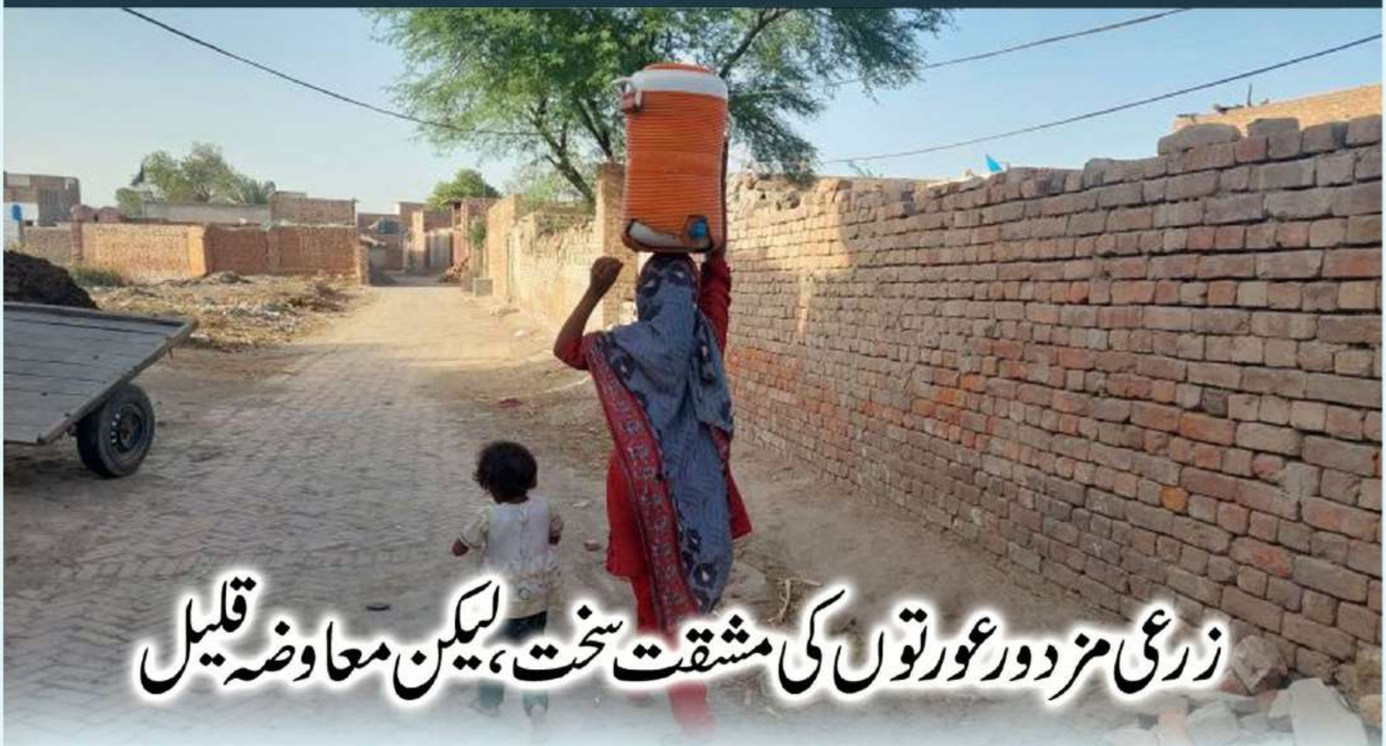

# زرعی مزدور عورتوں کی مشقت سخت، لیکن معاوضہ قلیل

بلال حبیب

شہر سے 12 کلومیٹر دور گاؤں سنی پل کی رہنے والی فضیلت بی بی کے ہاتھوں پہ پڑے نشان بتاتے ہیں کہ وہ کسی سخت محنت و مشقت کی وجہ سے ہیں۔ چالیس سالہ فضیلت بی بی 2 بچوں کی ماں ہے، اس کے 45 سالہ شوہر امتیاز احمد جو کہ بطور ڈرائیور شہر میں ایک بڑے گھر کا ملازم تھا دو سال پہلے ایک حادثے میں ایک ٹانگ محروم ہو گیا اور وہ اب کسی کام کے قابل نہیں رہا، لیکن فضیلت بی بی ہمت سے کام لیتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے مقامی زمیندار کے ہاں بطور زرعی مزدور کام کرنے لگی۔ کیونکہ جمع پونجی شوہر کے علاج معالجے میں خرچ ہوگئی اور بات فاقوں تک پہنچ گئی اس لیے مجبورا کام کے لیے نکلنا پڑا۔ فضیلت نے بتایا کہ اس کے ساتھ اور بھی عورتیں کھیتوں میں کام کرتی ہیں لیکن انہیں ان کی محنت کے برعکس معاوضہ ملتا ہے جس سے دو وقت کی روٹی بھی پوری ہو جائے تو غنیمت ہے۔ بعض اوقات تو طے شدہ معاوضے میں بھی ادھار کر لیا جاتا ہے اور کبھی تھوڑا سا آٹا اور گندم دے کر ٹال دیا جاتا ہے۔ فضیلت نے بتایا کہ سردیوں کے یخ بستہ ٹھنڈے مہینوں میں فصلوں کی بوائی سے لے کر گرمی کی تیز دھوپ میں فصلوں کی کٹائی تک، وہ اور اس کی ساتھی خواتین محنت کرتی ہیں لیکن ہمیں اجرت مردوں کے مقابلے میں کم دی جاتی ہے۔ فی ایکڑ مزدوری ایک ہزار روپے اگر ہو تو ہمیں 5 سو روپیہ ہی دی جاتی ہے۔ جبکہ مہنگائی جس حساب سے بڑھتی ہے اس حساب سے ہمارا معاوضہ نہیں بڑھتا۔

صحت کے حوالے سے فضیلت نے بتایا کہ مسلسل مشقت سے اسکا جسم اور ہڈیاں درد کرتی رہتی ہیں اور وہ خود کو بوڑھا محسوس کرتی ہے۔

شہر سے 3 کلومیٹر دور بستی کہور خان کی 24 سالہ ریکھا بی بی جو کہ اپنے بوڑھے والدین کے لیے سہارا ہے کے مطابق ہماری صبح کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب گاؤں کی اکثریت سو رہی ہوتی ہے۔ گھر کے جانوروں کے لیے پہلے چارے کا بندوبست کرنا پڑتا ہے پھر ناشتہ کی تیاری ہوتی ہے۔ ریکھا بتاتی ہیں کہ گھر گرہستی سے لے کر مال مویشیوں کی دیکھ بھال، فصلوں کی بوائی، کٹائی، چھڑائی اور صفائی، سب طرح کی مشقت میں خواتین مرودوں کے برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ غربت، کم اجرت اور بے پناہ کام کے باوجود کھیتوں میں کام کرنیوالی خواتین کی محنت کو تسلیم بھی نہیں کیا جاتا۔ یہاں کھیتوں میں کام کرنے والی اکثریت خواتین ہوتی ہیں لیکن ہمیں اس محنت کا پورا معاوضہ نہیں ملتا، کبھی فی من کے حساب سے پیسے ملتے ہیں تو کبھی فی ایکڑ کے حساب سے جبکہ ہم محنت مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ کرتے ہیں۔ ہمیں گھر سے بعض اوقات 25 سے 30 کلومیٹر دور بھی جا کر کام کرنا پڑتا ہے لیکن معاوضہ وہی رہتا ہے۔ بیماری کی صورت میں چھٹی کرنے پر دیہاڑی نہیں ملتی اور نہ ہی علاج کے پیسے ہمیں دیئے جاتے ہیں۔

مزدور ٹریڈ یونین و کسان رہنما محمود الحسن کے مطابق ہاری خواتین کا جنوبی پنجاب کے زمیندار

سب سے زیادہ استحصال کرتے ہیں۔ مرد مزدور کو جس کام کے 100 روپے مزدوری دی جاتی ہے اسی کام کے لیئے عورت مزدور کو 50 روپے مزدوری بھی نہیں دی جاتی، خواتین ہاری کو ان کی مشقت کے برابر معاوضہ نہ دینا ان کا معاشی قتل ہے، کم آمدنی کی وجہ سے وہ غذائی قلت کا سامنا کرنے کے ساتھ ساتھ پسماندہ زندگی گذارنے کی وجہ سے جلد وبائی امراض کا شکار ہو جاتی ہیں انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ آزاد اور مستند ذرائع سے ہاری خواتین کا سروے کروائے اور ان کی مشقت کے مطابق اجرت طے کر کے اس پر عمل درآمد بھی کروائے اور اگر اس سلسلے میں قانونی سازی کرنی پڑے تو باقاعدہ قانونی سازی کروا کر انہیں اس معاشی استحصال سے بچایا جائے۔ انہوں نے کہا کہ سیاسی جماعتوں کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ہاری خواتین کی مشقت کو جائز حق دینے کے عمل کو اپنے پارٹی منشور کا حصہ بنائیں اور سول سوسائٹی بھی ان کے حقوق کیلئے آواز بلند کریں۔

انسانی حقوق کے حوالے سے کام کرنے والے سوشل ورکر اشوک کمار کے مطابق نواحی علاقے کی بستی کہور خان میں 250 سے زائد خاندان ہندو برادری سے تعلق رکھتے ہیں جن کی خواتین

زرعی مزدور ہیں۔ اشوک کا کہنا تھا کہ یہاں زرعی مزدور خواتین کا کھیت میں کام کرنے کے حوالے سے کوئی قانون موجود نہیں۔ اگر کوئی زمیندار 400 روپے فی من کپاس چنائی کی مزدوری دے رہا ہے تو اگر مزدور خواتین زیادہ آ جائیں تو 300 روپے فی من ریٹ کر دے گا۔ اسی طرح گندم کی کٹائی کے لیئے جو فی من 2 سو روپے مزدوری دیتے تھے اب وہ مزدوری 2 من گندم کی کٹائی پر دیتے ہیں۔ گندم کا ریٹ تو بڑھا ہے لیکن مزدوری نہیں بڑھی۔

وفاقی ادارہ شماریات کی 2018ء میں جاری کی گئی رپورٹ کے مطابق زرعی شعبے میں کام کرنے والی ہر 100 میں سے 56 خواتین ہر ہفتے 50 گھنٹوں سے زیادہ کام کرتی ہیں جبکہ ہر 100 میں سے صرف 22 مرد زرعی مزدوروں کو ہر ہفتے اتنے گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود مرد زرعی مزدوروں کی اوسط ماہانہ اجرت 12 ہزار 7 سو روپے ہے جبکہ زرعی مزدور خواتین ہر ماہ اوسطاً صرف 7 ہزار 5 سو روپے کما پاتی ہیں۔ مجموعی طور پر وہ مردوں سے دوگنا سے بھی زیادہ کام کرتی ہیں لیکن ایک مرد کے کمائے ہوئے سو روپے کے مقابلے میں صرف 59 روپے کما پاتی ہیں۔

انسانی اور مزدوروں کے حقوق کے حوالے سے گزشتہ تین دہائیوں سے کام کرنے والے عبدالرب فاروقی کے مطابق جنوبی پنجاب کی زرعی مزدور خواتین ''پنجاب ویمن ایگری کلچرل ورکرز ایکٹ'' سے محروم ہیں۔ فاروقی چاہتے ہیں کہ ان زراعت پیشہ خواتین کی رجسٹریشن ہو اور ان کے لیئے قانون بنے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک ابتدائی مسودہ تحریر بھی کیا ہے جس کو کسی بڑے فورم پر جلد پیش کیا جائے گا۔

فاروقی نے بتایا کہ وومن ایگریکلچرل ورکرز یعنی کسان عورتیں یا زرعی مزدور خواتین جو کھیتوں میں کام کرتی ہیں کہ بے شمار مسائل ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ ان کی اجرت کا ہے انہیں بہت کم اجرت دی جاتی ہے۔ ان خواتین کے ہاتھ ہمیں کھانا بنا کے دے رہے ہوتے ہیں اور ہم ہی ان ہاتھوں کو نہیں پہچانتے۔ جتنے سروے ہوتے ہیں ان میں خواتین کے کاموں کو کام ہی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ان کے لیئے قانون بننا چاہیے تاکہ ان کو تحفظ کا احساس ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ سندھ وومن ایگریکلچرل ایکٹ بنا ہوا ہے جبکہ پنجاب میں نہیں بنا۔ اب چونکہ پنجاب کی نئی وزیر اعلی مریم نواز ایک خاتون ہیں تو ہماری ان سے درخواست ہے کہ ان استحصال زدہ ہاری خواتین کے حقوق بارے قانون پاس کروائیں تاکہ تاریخ اس حوالے سے انہیں یاد کرے۔ قانون سازی سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ کھیتوں میں کام کرنے والی خواتین کو ان کے حقوق کا پتہ ہوگا دوسرا زمیندار بھی ان کے معاشی استحصال سے قانون کی گرفت میں آسکیں گے۔

ڈسٹرکٹ آفیسر لیبر محمد نعیم کے مطابق پنجاب میں زرعی مزدوروں کے حوالے سے کوئی قانون سازی نہیں ہوسکی ہے، جس کی وجہ سے وہ ان کے معاملات کو نہیں دیکھ سکتے۔ ماضی میں اس بارے میں اقدامات کے حوالے سے بات تو ہوئی ہے لیکن قانون سازی نہیں ہوسکی۔ ان کا کہنا تھا کہ صرف کمرشل ایکٹیوٹی میں شامل مزدوروں کے بارے میں وہ جانچ پڑتال کرسکتے ہیں۔

# جعلی اور غیر رجسٹرڈ شدہ ادویات

## ادویہ سازی کے نظام کو بہتر اور قابل بھروسہ بنانے کی ضرورت ہے

سدرہ ایاز

شاید پاکستان کو معاشی بحران سے نکالنے اور یہاں کے عوام کو مہنگائی اور غربت سے نجات دلانے میں موجودہ حکومت آنے والے دنوں میں کام یاب ہوجائے یا حکومت کے وزیر مشیر کوئی ایسا منصوبہ پیش کردیں کہ عوام کو کچھ ریلیف ضرور مل جائے، مگر بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ اخلاقی پستی کا شکار بھی ہے جس کا علاج آسان نہیں ہے۔

علاج یا تدبیر تو اس وقت اختیار کی جائے گی جب ہم اخلاقی سطح پر گراوٹ کو مسئلہ یا مرض تسلیم کریں گے۔ بحیثیت قوم ہر شعبہ ہائے حیات میں انحطاط، زوال اور تنزلی کی ایک وجہ ہوسِ زر، حرص اور مفاد پرستی بھی ہے جس میں ہم اچھے بُرے کی تمیز سے محروم ہوچکے ہیں۔ ہمیں اپنی تجوریاں بھرنا ہیں اور اس کے لیے یہ سوچنا ضروری نہیں کہ غلط، ناجائز اور غیرقانونی کام کیا ہے۔ ادویہ سازی اور علاج معالجہ وہ حساس، اہم کام ہے جو نہایت ذمہ داری کا متقاضی ہے بلکہ ہمارا دین بتاتا ہے کہ انسانیت کی خدمت فرض ہے اور کسی ذی روح کی جان بچانا باعثِ اجروثواب ہے۔

کراچی کی بات کرتے ہیں جہاں ماہِ صیام میں بھی لوٹ مار، چوری اور ڈکیتی کے واقعات مسلسل جاری ہیں اور مزاحمت کرنے پر ڈاکو شہریوں کو گولی کا نشانہ بنا کر زندگی سے محروم میں ذرا نہیں جھجک رہے۔ شہر بھر میں پولیس کے ناکے لگے ہوئے ہیں اور موبائل گشت کر رہی ہیں مگر لوٹ مار کا سلسلہ نہیں رک رہا۔ دوسری طرف عوام کو اُن لٹیروں اور قاتلوں کا بھی سامنا ہے جن کی شناخت آسان نہیں ہے۔ ان کا طریقہ واردات ڈاکوؤں سے کچھ مختلف ہے۔ یہ بے حس اور مفاد پرست دراصل اُن کارخانوں کے مالک ہیں جن میں جعلی ادویہ تیار کی جارہی ہیں۔ کراچی میں گزشتہ دنوں ایک گھر پر چھاپہ مار کر انسانی زندگیوں سے کھیلنے والے دو ملزمان کو گرفتار کیا گیا ہے اور مزید گرفتاریوں کے بعد ہولناک انکشافات سامنے آئیں گے۔ تشویش ناک بات یہ ہے کہ یہ گروہ عام امراض اور معمولی نوعیت کے طبّی مسائل میں نہیں؟ بلکہ کینسر جیسے مہلک مرض اور دل کے مریضوں کے علاج کے لیے جعلی دوائیں بنا رہا تھا۔

کراچی کے علاقہ لائنز ایریا میں وفاقی تحقیقاتی ادارے (ایف آئی اے) اسٹیٹ بینک سرکل کراچی اور ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی کے عملے نے مشترکہ کارروائی کی اور جعل ساز گروہ کے دو کارندوں کو گرفتار کرلیا۔

عالمی ادارہ صحت کے مطابق دنیا بھر میں جعلی اور غیر معیاری ادویات کے کاروبار کا سالانہ حجم اربوں ڈالر کے قریب ہے۔ یہ مسئلہ صرف پسماندہ اور پاکستان جیسے ممالک کا نہیں، لیکن پاکستان میں ان کے خلاف مؤثر اور ٹھوس اقدامات یا کارروائی نہ ہونے سے انسانی زندگیوں کو خطرات بڑھ رہے ہیں۔ اقتصادی ماہرین بتاتے ہیں کہ دنیا میں کئی رجسٹرڈ صنعتوں کو جعل سازوں اور نقالوں کی وجہ سے مالی خسارہ اور ساکھ کو نقصان ہوتا ہے جن کی مصنوعات کی غیر معیاری نقل تیار کر کے ناجائز طریقے سے دولت کمائی جاتی ہے۔ پاکستان میں یہی ہوس لاکھوں انسانوں کی موت کی وجہ بنتی ہے اور صرف کراچی ہی نہیں ملک کے دیگر شہروں میں بھی جعلی اور غیر معیاری ادویہ تیار کرنے والے سرگرمِ عمل ہیں۔

پاکستان میں معیاری ادویہ کی تیاری اور خرید و فروخت یقینی بنانے اور جعل سازی کی روک تھام کے لیے ادارہ ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی یا ڈریپ موجود ہے۔ لیکن یہ 'پیارا پاکستان' ہے اور اس میں اکثر غیرقانونی اور ناجائز کام اس وقت تک جاری رہتے ہیں لیکن جعلی اور غیر معیاری ادویہ کا کاروبار ا?ج بھی کئی انسانی جانوں کے ضیاع کا باعث بن رہا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ عالمی ادارہ صحت کے رکن ممالک میں سے چند 20 فیصد ریاستیں ہی ادویہ سازی سے متعلق کوالٹی کنٹرول کا بہترین اور مؤثر نظام رکھتی ہیں۔ اس کے برعکس پاکستان میں صورتِ حال بدتر ہے۔ یہاں کراچی جیسے شہر میں ایک چھوٹے سے گھر میں بھی یہ سفاک اور ہوسِ زر میں مبتلا لوگ دوا تیار کر کے آسانی سے مارکیٹ میں؟ فروخت کردیتے ہیں جہاں سے یہ شہر کے دوافروشوں تک پہنچ جاتی ہے اور مریض انھیں خرید کر استعمال کرتے ہیں۔

جعلی اور غیر معیاری ادویہ کے استعمال سے کئی مریض مزید اپنی صحت خراب کرلیتے ہیں اور اکثر انفیکشن کا شکار ہوجاتے ہیں اور مرض میں شدت آجاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ سالانہ بڑی تعداد میں ملک بھر میں اموات کی ایک بڑی وجہ جعلی اور غیر معیاری دوا کا استعمال بھی ہے۔ یہ دوائیں نزلہ زکام، الرجی، درد کش، کھانسی اور پیٹ وغیرہ کے عام امراض ہی کی نہیں ہوتیں؟ بلکہ دورانِ حمل خواتین کے لیے ضروری وٹامنز اور دوسرے عوارض اور طبی پیچیدگیوں کے لیے بھی لاعلمی میں لوگ استعمال کرتے رہتے ہیں جس کا ظاہر ہے نقصان حاملہ اور اس کے بچّے کو ہوتا ہے۔

ہم عام درد کش دواؤں سمیت جان بچانے میں؟ مددگار کئی دواؤں کی قلت کراچی میں دیکھ چکے ہیں اور معیاری پروڈکٹ کے مارکیٹ میں نہ ہونے کے باعث جعل ساز موقع سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مریض کو اگر اس دوران رجسٹرڈ کمپنی کی معیاری ادویات مل بھی جائیں تو یہ بلیک میں خریدنی پڑتی ہیں۔ یعنی اصل سے زائد قیمت ادا کر کے۔

عالمی ادارہ صحت اور پاکستان میں ڈاکٹروں اور صحت و ادویہ سازی سے متعلق تنظیموں کی جانب سے حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کروائی جاتی رہی ہے کہ جعلی ادویات کی روک تھام یقینی بنائی جائے ورنہ اس کے تباہ کن نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ ایک عالمی ادارے کی رپورٹ میں تو یہ تک کہا گیا تھا کہ جعلی ادویات کا کاروبار بہت جلد دنیا بھر میں موجود غیر قانونی منشیات کے کاروبار سے بڑھ سکتا ہے۔ عالمی انسدادِ منشیات بورڈ کا کہنا ہے کہ حکومتوں کو ادویات کے متعلق موجودہ قوانین پر سختی سے عمل درآمد کرانا چاہیے اور سوشل میڈیا کے ذریعے ادویات کے غیرقانونی کاروبار سے متعلق نئے قوانین متعارف کرانا چاہییں۔

کراچی میں حالیہ کارروائی میں ملزمان سے بڑی مقدار میں جعلی اور غیر رجسٹرڈ شدہ ادویات برآمد ہوئی ہیں۔ گھر میں جعلی ادویات کی تیاری میں استعمال ہونے والی مشینیں اور آلات موجود تھے۔ حکام کے مطابق گرفتار ملزمان عبدالسعو دفیصل اور محمد آصف اپنے گھر سے جعلی ادویات کی مینوفیکچرنگ، پیکنگ اور سیمپل تیار کر رہے تھے جس میں 82 سے زیادہ مختلف اقسام اور کمپنیوں کی ادویات شامل ہیں۔ یہ امراض قلب، کینسر، ذیابطیس، ہائپر ٹینشن اور دیگر امراض میں استعمال کرنے کے لیے تیار کی جانے والی جعلی دوائیں تھیں جنھیں کراچی کے پوش علاقوں میں میڈیکل اسٹورز پر سپلائی کرنے کا انکشاف ہوا ہے۔

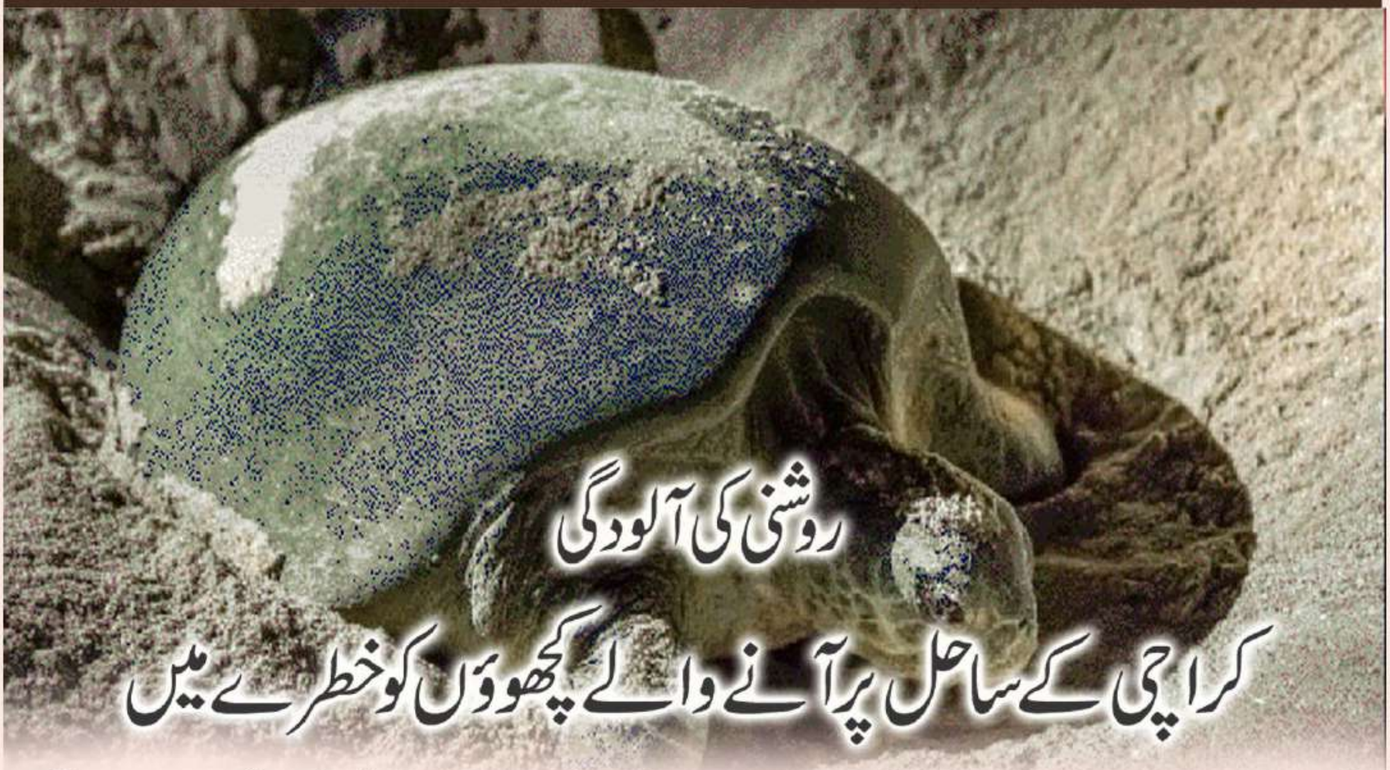

# روشنی کی آلودگی

# کراچی کے ساحل پر آنے والے کچھوؤں کو خطرے میں

14 اگست 2023 کو جب پاکستان نے یوم آزادی منایا تو صوبہ سندھ کے وزیراعلیٰ نے 5.9 کلومیٹر طویل ماڑی پور سڑک کا افتتاح کیا۔ عالمی بینک نے اس سڑک کو ٹھیک کرنے کے لئے رقم دی۔ یہ کراچی شہر کے لئے ایک بڑے منصوبے کا حصہ ہے، جس کے لئے عالمی بینک نے کُل 840 ملین روپے (3 ملین امریکی ڈالر) کی مالی اعانت فراہم کی ہے۔ اس منصوبے کو کمپیٹیٹو اینڈ لیوایبل سٹی آف کراچی (کلک) کا نام دیا گیا ہے۔

اس کے صرف 15 دن بعد ہاکس بے اور سینڈسپٹ کے ساحلوں پر کچھوؤں کے انڈوں سے نکلنے کا موسم شروع ہوا، جونئی افتتاح شدہ سڑک سے تقریباً 100 میٹر کی دوری پر واقع ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی نے بھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ سڑک کی لمبائی کے ساتھ 120 واٹ کی پانچ سو ایل ای ڈی اسٹریٹ لائٹس سمندری جنگلی حیات خاص طور پر کچھوؤں کی افزائشِ نسل کی جگہوں (گھونسلوں) کو کس طرح متاثر کریں گی۔

پاکستان میں کراچی کے سمندر کے کنارے موجود ساحلی پٹی خطرے سے دوچار کچھوؤں کی افزائشِ نسل کے لیا اہم جگہیں ہیں جہاں وہ انڈوں سے نکلتے ہیں، لیکن سڑکوں اور ریستورانوں کی مصنوعی روشنی سے اُنہیں خطرات لاحق ہیں

پاکستان میں ورلڈ وائڈ فنڈ کے میرین پروگرام کو آرڈینیٹر شعیب عبدالرزاق نے دی تھرڈ پول کو بتایا کہ اِن ساحلوں کی نرم ڈھلوانیں اور ریتلی ساخت کچھوؤں کے گھونسلوں کے مقامات کے لئے مثالی ہیں۔ تاہم، یہ ناخوشگوار سفید ایل ای ڈی لائٹس اس جنگلی حیات کو درہم برہم کرسکتی ہیں۔

بحر ہند و بحرالکاہل کی جنگلی حیات میں سمندری ماحولیاتی نظام پر آرٹیفیشل لائٹ ایٹ نائٹ کے اثرات پر 2022 کے ایک تحقیقی مقالے میں اس

بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ روشنی کی آلودگی (بیرونی مصنوعی روشنی کا حد سے زیادہ استعمال) کچھوؤں کے گھونسلوں اور اُن کے انڈوں کی افزائش کے لئے خاص طور پر اہم خطرہ ہے۔ مصنوعی روشنیاں مادہ کچھوؤں کی سمت کو متعین کرنے کی صلاحیتوں میں مداخلت کرتی ہیں جب وہ اپنے گھونسلوں کی جگہوں کا انتخاب کررہی ہوتی ہیں، اور ساتھ ہی انڈوں سے نکلنے والے کچھوؤں کے بچوں کو بھی متاثر کرتی ہیں جب وہ گھونسلوں سے نکل کر ساحل تک اور پھر سمندر کی طرف اپنا راستہ بناتے ہیں۔

رزاق نے بتایا کہ غروب آفتاب کے بعد مادہ کچھوے پانی میں ڈوبی رہتی ہیں اور انتظار کرتی ہیں کہ اونچی لہر انہیں ساحل کے کچھ فاصلے طے کرنے کیلئے دھکیلے۔ اس دوران وہ خطرات کو بھی بھانپ لیتی ہیں، اور اگر "انسانی سرگرمیاں یا روشنیاں نظر آتی ہیں، تو اس بات کے امکانات قوی ہوجاتے ہیں کہ وہ انڈے دیئے بغیر سمندر میں واپس آ جائیں، یا جب ان کے لئے کوئی خطرہ نہ ہو تو دوبارہ ساحل کی طرف لوٹ آئیں۔"

انفارمیشن سسٹم کے ماہر اور سمندری کچھوؤں کے محقق عمیر بن ضمیر نے وضاحت کی کہ انڈوں سے نکلنے والے کچھوؤں کے نئے بچے اور بالغ کچھوے دونوں قدرتی طور پر اُفق کی قدرتی روشنی کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اگر قدرتی روشنی ضرورت سے زیادہ مصنوعی روشنی سے متاثر ہوتی ہے تو یہ اُن کے فطری راستے میں مداخلت پیدا کرسکتی ہے۔

محکمہ جنگلی حیات سندھ کے میرین ٹرٹل کنزرویشن کے سربراہ اشفاق علی میمن کے مطابق کراچی میں کچھوؤں کی افزائشِ نسل کا موسم ستمبر سے فروری کے وسط تک ہوتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس موسم (ستمبر 2023ء تا فروری 2024ء) کے دوران ساحل سمندر کا دورہ کرنے والی 650 مادہ کچھوؤں میں سے 275 انڈے دیئے بغیر سمندر میں واپس آگئیں۔ پچھلے سال (ستمبر 2022 سے فروری 2023) 500 مادہ کچھوؤں نے ساحل کا دورہ کیا، اور 250 انڈے دیئے بغیر واپس چلی گئیں۔ مادہ کچھوے کئی عوامل کی وجہ سے انڈے دیئے بغیر سمندر میں واپس آجاتے ہیں جن میں غیر ضروری اور ناپسندیدہ انسانی مداخلت، ساحل پر ہونے والی ترقی، سمندری ملبہ، پلاسٹک، آوارہ کتوں جیسے شکاریوں کی موجودگی اور روشنی کی آلودگی کے اثرات شامل ہیں۔

ماڑی پور روڈ پر چمکدار سفید ایل ای ڈی لائٹس کی تنصیب کے بعد انڈے دیئے بغیر لوٹنے والے کچھوؤں کا تناسب دراصل گر گیا، لہٰذا تنصیب سے صرف ایک سال بعد، اعداد و شمار سے کوئی نتیجہ اخذ

کرنا قبل از وقت ہوگا۔

لیکن ایک معیاری ماحولیاتی جائزے کے بغیر یہ لائٹس کیسے نصب کی گئیں، لہٰذا اِس رویےکی تحقیقات کرنے سے یہ مزید واضح ہوا ہے کہ مقامی انتظامیہ کچھوؤں کی افزائشِ نسل کی جگہوں کو نظر انداز کرتی رہی ہے۔

منصوبے کے ڈیزائن کے دوران کچھوؤں کی پناہ گاہ نظر انداز ہوئی

19 دسمبر 2023 کو پالیسی ریسرچ آرگنائزیشن دی سٹیئرزنری نے جنوبی ایشیا کے لئے ورلڈ بینک کے اربن ڈیولپمنٹ، ریزیلینس اور لینڈ پریکٹس مینیجر عبدالراز ایف خلیل کو ای میل کی، جس میں انہوں نے کلک منصوبے کے ذریعے سمندری ماحولیاتی نظام پر روشنی کی آلودگی کے بارے میں خدشات کو اُجاگر کیا۔ دی سٹیئرزنری کو خدشہ تھا کہ ورلڈ بینک جس پروجیکٹ کو فنڈ دے رہا ہے وہ روشنی کی آلودگی کا سبب بن سکتا ہے۔ ورلڈ بینک نے اُسی مہینے سائٹ کا دورہ کیا تاکہ وہ خود چیزوں کا جائزہ لے سکے۔

کلک کے ماحولیاتی تحفظ کے ماہر ظہیر احمد نے دی تھرڈ پول کو بتایا کہ عالمی بینک کی ٹیم کے ساتھ ماڑی پور روڈ کے حوالے سے روشنی کی آلودگی کے متنوع حل پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ ان میں سفید روشنی کو سرخ رنگ میں تبدیل کرنے کے لئے ایل ای ڈی لائٹس کو سرخ سیلوفین سے ڈھانپنا، تیز سفید روشنیوں کو دھندلا کرنا، یا کچھوؤں کی افزائشِ نسل کے موسم کے دوران روڈ پر موجود تمام لائٹس آن رکھنے کے بجائے ایک لائٹ چھوڑ کر دوسری کو آن رکھنا شامل تھا۔

انہوں نے کہا کہ کلک نے محکمہ جنگلی حیات سندھ سے سفارشات طلب کی ہیں، جس کے بعد وہ حتمی فیصلہ کریں گے۔

پروجیکٹ کے ڈیزائن کے مرحلے کے دوران یہ مسائل نہیں اٹھائے گئے تھے۔ عالمی بینک کی ہدایات کے مطابق کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن (کے ایم سی) نے سڑکوں کی بحالی کے لئے ماحولیاتی اور سماجی انتظام کا منصوبہ پیش کیا ہے۔ لیکن منصوبے میں سندھ کی صوبائی حکومت کے زیر انتظام کچھوؤں کے سمندری تحفظ کی جگہ کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ جبکہ اس منصوبے میں یہ بتایا گیا ہے کہ "پروجیکٹ کا علاقہ قریبی ساحلوں سے گھرا ہوا ہے اور یہاں تک کہ یہاں کچھوے بھی عام دکھائی دیتے ہیں۔" اس میں یہ بھی واضح طور پر کہا گیا ہے کہ "ذیلی پروجیکٹ کے علاقے کے قریب جنگلی حیات کی کوئی ریکارڈ شدہ پناہ گاہیں یا گیم ریزرو) زمین کا ایک محفوظ علاقہ جہاں آبی حیات باحفاظت رہ سکتے ہیں یا اُنھیں قانونی طریقے سے شکار کیا جاسکتا ہے) موجود نہیں ہیں۔"

کلک کے لئے ورلڈ بینک کی ٹاسک ٹیم کے سربراہ طاہرا اکبر نے 18 جنوری 2024 کو دی سٹیئرزنری کو لکھا کہ جب "کلک پروجیکٹ تیار کیا گیا تھا تو دیگر جانداروں کے قدرتی ٹھکانوں پر اثرات کا تصور نہیں کیا گیا تھا۔" یہی وجہ ہے کہ عالمی بینک کی "آپریشنل پالیسی 4.04 اہم قدرتی ٹھکانے" کا آغاز نہیں کیا گیا۔

18 مارچ 2024 کو، اکبر نے دی تھرڈ پول کو تصدیق کی کہ عالمی بینک نے "قدرتی ٹھکانوں کے تحفظ سے متعلق ہماری پالیسیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے" سڑک منصوبے کے دوسرے حصے کو روکنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ایک ہفتے بعد انہوں نے لکھا کہ عالمی بینک نے کلک کے باہمی ابلاغ کے رابطہ کار کے ذریعے کے ایم سی سے کہا تھا کہ وہ موجودہ لائٹس پر صرف کور لگانے کے بجائے لائٹس کو پیلے نارنجی رنگ (امبر) میں تبدیل کریں اور یہ اِس لئے کہا گیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ موسمی اثرات کی وجہ سے کور ٹوٹ سکتے ہیں اور شاید مقامی حکومت انہیں ٹھیک کرنے میں زیادہ دلچسپی نہ لے۔

کمرشل لائٹس

میمن کے لئے روشنی کی آلودگی کا خطرہ بدستور برقرار ہے، جن کی آٹھ رکنی ٹیم ساحل کے آٹھ کلومیٹر کے رقبے پر کچھوؤں کے انڈوں اور بچوں کی حفاظت کرتی ہے۔ میمن نے کہا کہ محکمہ وائلڈ لائف نے ساحل سمندر کی تمام جھونپڑیوں کو مطلع کیا ہے کہ وہ غروب آفتاب کے بعد بالخصوص کچھوؤں کے انڈوں سے نکلنے کے موسم کے دوران لائٹس بند کردیں۔

تاہم، رات کے وقت، خاص طور پر ہاکس بے ساحل پر کچھوؤں کی افزائشِ نسل کے موسم کے دوران، ساحل سمندر کے بالکل نزدیک کئی گھر نہ صرف روشن رہتے ہیں بلکہ پکنک کرنے والے ٹارچ اور سرچ لائٹس کا استعمال کرتے ہوئے انڈوں سے نکلنے والے کچھوؤں کے بچوں کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔

رات گئے ہونے والی پارٹیاں کچھوؤں کی افزائشِ نسل کے موسم کے دوران براہ راست سمندر کے کنارے نیلی، پیلی اور سفید روشنیاں ڈالتی ہیں اور یہ سب بہت عام ہے۔

ہاکس بے ساحل پر کے ایم سی کی اجازت سے چلنے والا دعا ریسٹورنٹ براہ راست ساحل پر چمکدار سفید اور پیلی روشنیاں ڈالتا ہے جہاں سمندری کچھوے انڈے دیتے ہیں۔

سندھ وائلڈ لائف ڈپارٹمنٹ کی طرف سے جنگلی حیات کا مشاہدہ اور نگرانی کرنے والے محمد عامر کا کہنا ہے کہ پکنک کرنے والوں کو اپنی جھونپڑیوں کی لائٹیں بند کرنے پر قائل کرنے کی کوششوں کے باوجود وہ اکثر ایسا کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ اگرچہ مقامی ماہی گیر برادری سمندری کچھوؤں کے تحفظ کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے، لیکن تعلیم یافتہ شہر کے باشندے اِن کوششوں کے بارے میں برائے نام ہی ردعمل ظاہر کرتے ہیں اور زیادہ توجہ نہیں دیتے ہیں۔

یہ پاکستان میں روشنی کی آلودگی کے بارے میں ایک طویل رپورٹ پر تازہ ترین مضمون ہے، جسے دی سٹیئرزنری نے شائع کیا ہے، اور اسے انٹرنیوز کے ارتھ جرنلزم نیٹ ورک کے تعاون سے تیار کیا گیا ہے۔

# پتنگ کی قاتل ڈور مزید کتنی جانیں لے گی؟

وقار احمد شیخ

پتنگ کی ''قاتل ڈور'' نے کئی انسانوں کی ''سانسوں کی ڈور'' کو منقطع کر دیا ہے۔

افطار میں کچھ ہی وقت باقی تھا، آصف اپنی والدہ کے ساتھ افطاری کرنا چاہتا تھا، اس لیے وہ تیزی سے بائیک چلاتا ہوا اپنے گھر جا رہا تھا کہ اچانک اسے اپنے گلے پر کسی چیز کے ٹکرانے اور شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ آصف بائیک سے گر گیا، اپنی تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے اس نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔

سڑک سے گزرنے والے لوگ بھاگ کر اس کی طرف آ رہے تھے۔ صرف چند سیکنڈ میں آصف کے پورے کپڑے خون میں لت پت ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھ سکتا، وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ آصف کی زندگی کی ڈور، کسی پتنگ کی ''بے رحم قاتل ڈور'' نے منقطع کر دی تھی۔

پتنگ کٹنے پر ''بوکاٹا'' کی آوازیں لگانے والے انسانی گلا کٹنے پر چپ سادھے ہوئے ہیں۔ ملک میں روز اس طرح کے واقعات سامنے آ رہے ہیں لیکن پتنگ بازی کے شوقین باز نہیں آ رہے۔

پتنگ بازی ایک دلچسپ مشغلہ رہا ہے۔ نیلے آسمان کی وسعتوں میں سفید، اودے، سرمئی بادلوں کے ساتھ ہوا کے دوش پر اٹھکیلیاں کرتی رنگ برنگی پتنگیں سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتی ہیں۔

پاکستان میں بھی یہ کھیل بہت مقبول ہے لیکن اب کچھ عرصے سے پتنگ بازی پر حکومت کی جانب سے بار بار پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ پتنگ بازی جیسے مشغلے پر پابندی کی بنیادی وجہ وہ ''قاتل ڈور'' ہے جس نے اَن گنت افراد کی ''سانسوں کی ڈور'' کو منقطع کر دیا ہے۔ پاکستان بھر میں پتنگ کی

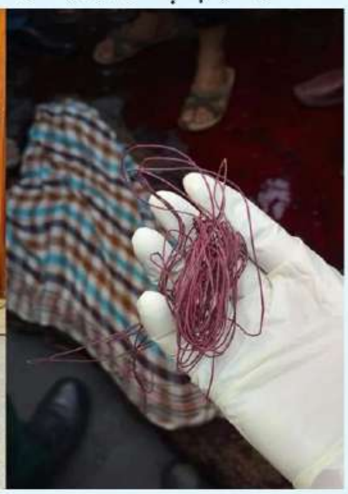

اس قاتل ڈور نے نہ صرف درجنوں افراد کو شدید زخمی اور ہمیشہ کیلیے آواز سے بھی محروم کر دیا، بلکہ کئی افراد اس ڈور کا شکار ہو کر زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

پتنگ بازی کے باعث ہونے والے حادثات کے پیش نظر امسال بھی حکومت کی جانب سے پتنگ بازی پر پابندی عائد کی گئی تھی لیکن کوئی خاطر خواہ نتائج سامنے نہ آ سکے اور نہ صرف یہ مشغلہ جاری رہا بلکہ کئی حادثات بھی رپورٹ ہوئے۔ پتنگ کی ڈور سے ہلاکتوں کی شرح پنجاب میں سب سے زیادہ ہے۔

اس سال کی ابتدا سے ہی گلے پر ڈور پھرنے سے کئی افراد کے زخمی ہونے کی اطلاعات میڈیا کے ذریعے منظر عام پر آئیں۔ حالانکہ ''انسداد پتنگ بازی ایکٹ'' بھی موجود ہے لیکن پاکستان میں کسی بھی قانون پر اس کی روح کے مطابق عملدرآمد ہوا ہی کب ہے؟ انسداد پتنگ بازی کی ٹیمیں پتنگ بازوں کے خلاف کریک ڈاؤن میں سرگرم تو ہیں لیکن ان کی کارروائیاں معصوم بچوں کی پکڑ دھکڑ اور انھیں سرزنش کرنے تک ہی محدود ہیں۔

پنجاب پولیس کے ترجمان کے مطابق پتنگ بازی پر ممانعت کے قانون کی خلاف ورزی کرنے پر صرف ایک ماہ میں 2855 مقدمات درج کیے گئے اور 2991 افراد کو گرفتار کیا گیا ہے۔ فیصل آباد میں ہونے والے اس حالیہ واقعے کے بعد ہی پولیس نے چوبیس گھنٹوں کے دوران پتنگ بازی میں ملوث 512 افراد کو گرفتار کیا، اور ساٹھ ہزار کے قریب پتنگیں، سات سو ڈوریں اور چرخیاں وغیرہ بھی برآمد کی گئیں۔ پنجاب پولیس کے مطابق گزشتہ ایک ماہ کے دوران مجموعی طور پر ایک لاکھ سے زیادہ پتنگیں ضبط کر کے مقدمات درج کیے گئے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود بھی کوئی مثبت نتائج سامنے نہیں آ سکے۔ کیا وجہ ہے کہ پتنگ بازوں کے ساتھ دھاتی ڈور اور پتنگیں بنانے والوں کے خلاف کریک ڈاؤن نہیں کیا گیا؟ جب مارکیٹ میں پتنگیں اور قاتل دھاتی ڈور ہی دستیاب نہیں ہو گی تو پتنگ باز کیسے اس کھیل میں شریک ہوں گے؟ لیکن یہاں بھی وہی حال ہے کہ گٹکا، ماوا پر پابندی عائد کرنے کے باوجود ان کے بنانے والوں پر کوئی قدغن نہیں لگاتا اور ''اوپری کمائی'' کیلیے سب کو کھلی چھوٹ دے دی جاتی ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ آخر پتنگ بازی کا یہ دلچسپ مشغلہ ایک خونیں کھیل کیسے بن گیا؟ آخر کیوں پتنگ بازی سے انسانی ہلاکتوں کی خبریں سامنے آ رہی ہیں؟ صرف دو دہائی پہلے تک بھی پتنگ بازی اور بسنت کو ایک ثقافتی کھیل کا درجہ حاصل

تھا۔ پاکستان کے صوبہ پنجاب میں ماہِ فروری کی آمد کے ساتھ ہی بہار کے استقبال اور بسنت منانے کیلیے بطورخاص پتنگ بازی کا اہتمام کیا جاتا تھا۔لیکن وقت کے ساتھ نہ صرف اس کھیل کو''غیر شرعی'' قرار دیا جانے لگا بلکہ کئی غیرقانونی طریقوں اور پتنگ اڑانے میں استعمال کی جانے والی غیر قانونی ڈور کے استعمال نے بھی اس مشغلے پر پابندی کی راہ ہموار کی۔

پتنگ باز دوسروں کو نیچا دکھانے اور ان کی پتنگ کاٹنے کیلیے ایسی دھاتی ڈور کا استعمال کرتے ہیں جسے مختلف کیمیکلز ملا کر تیار کیا جاتا ہے۔نتیجتاً وہ ڈور آسانی سے ٹوٹتی نہیں اور یہی ڈور کسی راہ گیر یا موٹرسائیکل اور کھلی گاڑیوں میں سوار لوگوں کا گلا کاٹنے کا بھی باعث بن جاتی ہے۔کانچ کے ٹکڑوں سے بنا ہوا مانجھا، نائیلون اور دھاتی ڈور اور کیمیکل زدہ ڈور کسی چھری کی دھار کی طرح تیز ہوتے ہیں۔ جب ایسی ڈور کی پتنگ کٹ جائے تو وہ ڈور لامحالہ نیچے گرتی ہے جسے پتنگ باز تیزی سے کھینچتے ہیں،ایسے میں وہ نیچا اپنے راستے میں آنے والے راہگیر یا موٹرسائیکل سوار کیلیے کسی تلوار سے کم نہیں ہوتی۔

موٹرسائیکل سواروں کو پتنگ کی اس قاتل ڈور سے بچنے کے لیے بائیک کے سامنے حفاظتی لچک دار راڈ کا استعمال کرنا چاہیے۔

پتنگ بازی سے ہونے والی ہلاکتوں کو دیکھتے ہوئے تو پتنگ بازی پر پابندی کے حکومتی فیصلے کو سراہا جانا چاہیے۔ لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو ترستے عوام کو ایک دلچسپ مشغلے سے محروم کرنے کے بجائے ان عوامل پر پابندی عائد کی جاتی، جس کی وجہ سے یہ مشغلہ ایک ''قاتل کھیل'' بن گیا۔ ہر کھیل کے کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں تو کیا پتنگ بازی کیلیے بھی حکومت کی جانب سے کچھ اصول وضع نہیں کر دینے چاہیے تھے؟ پتنگ بازی پر پابندی لگانے کے بجائے اس غیر قانونی کیمیکل زدہ دھاتی ڈور پر پابندی عائد کی جانی چاہیے تھی جو ایسے حادثات کی وجہ بن رہی ہے۔ پتنگوں کیلیے سائز کی پابندی اور ڈور کا معیار مقرر کیا جانا چاہیے۔ پتنگ بازی کیلیے مخصوص جگہیں مختص کی جانی چاہئیں۔ایسے علاقوں میں پتنگ بازی کی ممانعت کی جانی چاہیے جہاں حادثات کا خدشہ ہو۔

حکومت کے علاوہ یہ عوام کا بھی فرض ہے کہ اس مشغلے کو ایک کھیل ہی رہنے دیں، کسی کیلیے مصیبت نہ بنائیں۔ایسا عمل نہ کیجیے جس سے کوئی حادثہ رونما ہونے کا خدشہ ہو۔ والدین بھی اپنے بچوں کو سمجھائیں اور ان پر نظر رکھیں۔اور سب سے اہم کہ پتنگ باز ایسی ڈور کا استعمال نہ کریں جو حادثات کا باعث بنے۔

# ہاؤسنگ سوسائٹیز کو بچائیے، کرپشن کو نہیں

محمد اقبال

یوں لگتا ہے حکومتی ادارے کرپٹ سوسائٹی مینجمنٹ اور لینڈ مافیا کے ہاتھوں یرغمال ہو چکے ہیں۔

اپنا گھر ایک ایسی خواہش ہے کہ ہر شخص جو اس دنیا میں آیا ہے وہ ضرور اپنی زندگی میں اس کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح اُسے اپنی چھت میسر آجائے۔ لیکن بدقسمتی سے آج بھی بہت بڑی تعداد ہمارے ملک میں کرایے کے مکانوں میں رہنے پر مجبور ہے۔

کراچی، جو دنیا کا آٹھواں زیادہ گنجان آبادی والا شہر ہے اور جس کی کثیر تعداد مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس آبادی پر مشتمل ہے، یہی لوگ زیادہ متاثر نظر آتے ہیں اور ہر آنے والا دن ان کیلیے نئی مشکلات لاتا ہے کیونکہ مہنگائی میں جس رفتار سے اضافہ ہوا ہے اُس رفتار سے آمدنی کے ذرائع نہیں بڑھے۔ اور آج حالات یہ ہیں کہ لوگوں کو اپنی چھت کا حصول ایک خواب نظر آنے لگا ہے۔

آزادی کے بعد کراچی میں کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کے کلچر کی حوصلہ افزائی کی گئی تاکہ مہاجرین کی آبادکاری کی جاسکے۔ یہ تجربہ اتنا بہترین رہا کہ 1970 میں شہید ذوالفقار علی بھٹو نے کراچی کیلیے اسکیم 33 میں ہزاروں ایکڑ زمین کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹیز کیلیے مختص کی تاکہ غریب اور کم آمدنی والوں کو چھت میسر آسکے۔ لیکن بدقسمتی سے آہستہ آہستہ یہ پروجیکٹ افسر شاہی میں بیٹھے کرپٹ افسران اور نااہل سوسائٹی مینجمنٹ کے ہاتھوں برباد ہونے لگا اور ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ کراچی میں لوگوں نے اپنی جمع پونجی تو سوسائٹیز میں اپنے پلاٹ کے نام پر جمع کروائی لیکن کبھی پلٹ کر سوسائٹی مینجمنٹ سے ڈیولپمنٹ کے بارے میں نہیں پوچھا اور میرے خیال میں یہ تمام لوگ بھی جرم میں برابر کے شریک ہیں۔

آج بیشتر سوسائٹیوں کے ممبران سوسائٹی مینجمنٹ کی نااہلیوں اور کرپشن سے پریشان ہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں سے یہ کرپشن کا ''مہلک وائرس'' ایسے اسٹیٹ ایجنٹس کی وجہ سے زیادہ پھیلا ہے جو کہ اس بزنس میں صرف اس لیے آتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ مال بنایا جائے۔ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ چھاتہ بردار اسٹیٹ ایجنٹ ایسے پراپرٹی کے کاروبار کرنے والوں کیلیے بھی شرمندگی کا باعث بن رہے ہیں جو کہ بہت ایمانداری سے کام کرتے ہیں۔ یہ وائرس بہت تیزی سے سندھ کی کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹیز میں پھیلا ہے اور کراچی اس مہلک وائرس سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہے۔ بدقسمتی سے ہماری حکومتیں اس ''کرپشن وائرس'' کو کنٹرول کرنے میں ناکام نظر آتی ہیں۔ جس کے باعث ہر روز کوئی نہ کوئی معصوم شہری اس وائرس کا شکار ہو کر اپنی جمع پونجی لٹا بیٹھتا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر سوسائٹیز میں صورتحال اسی طرح غیر منظم رہی تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ سندھ کے حکمران اور افسر شاہی مسلسل اس معاملے میں غفلت کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کرپٹ سوسائٹی مینجمنٹ اور لینڈ مافیا کے ہاتھوں یرغمال ہو چکے ہیں۔

غریب سوسائٹی ممبران اس انتظار میں ہیں کہ کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹیز میں لگے اس وائرس سے کون نجات دلائے گا؟ کیا ارتغرل آئے گا؟ یا پھر ہمارے قومی و صوبائی ادارے غریب سوسائٹی ممبران کی دعائیں لیں گے۔

کوآپریٹو سوسائٹیز کو بہتر اور موثر طریقے سے چلانے کیلیے جس طرح دنیا کے دیگر ممالک میں قانون کی عملداری کو یقینی بناتے ہیں اور جس کا فائدہ اُن ممالک کے لوگوں کو ہو رہا ہے، بالکل اسی طرح ہماری حکومتوں کو بھی صرف قانون سازی ہی نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس کی عملداری کو بھی یقینی بنانا چاہیے۔ کراچی میں بھی بہت سی ایسی کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹیز موجود ہیں جنھوں نے اپنے ممبران کو ڈیلیور کیا ہے۔ اُن کوآپریٹو سوسائٹیز کی کامیابی کی ایک وجہ قانون کی عملداری اور فول پروف سسٹم کی موجودگی ہے جو سوسائٹی کو کرپشن سے پاک اور غیر منظم ہونے سے روکے رکھتا ہے۔

موجودہ صورتحال میں سندھ گورنمنٹ مندرجہ ذیل اقدامات کر کے سندھ کی کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹیز کو صحیح طریقے سے عوام کی فلاح و بہبود کا ادارہ بنا سکتی ہے اور اس کے بعد قوی امید کی جاسکتی ہے کہ صوبے اور خصوصاً کراچی کے عوام اپنے خواب کو حقیقت میں تبدیل ہوتے دیکھ سکیں، یعنی اپنے گھر بنا سکیں۔

1۔ کوآپریٹو ڈپارٹمنٹ کی ری اسٹرکچرنگ کرنا

a) میرٹ پر کوالیفائیڈ لوگوں کی تقرری کرنا

b) ڈپارٹمنٹ کو کمپیوٹرائزڈ کرنا، جس کے ذریعے لوگ کسی بھی سوسائٹی کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں اور فراڈ سے بچ سکیں۔

2۔ ایسی تمام سوسائٹی مینجمنٹ کو بلیک لسٹ کرنا جنھیں پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہو اور وہ اپنے ممبران کو پزیشن نہ دے سکی ہوں۔

3۔ مینجنگ کمیٹی کے ممبران کی اسکروٹنی اس طرح کی جائے کہ صرف اچھی شہرت کے لوگ ہی کمیٹی کا حصہ بن سکیں۔

4۔ تمام سوسائٹیز کو پابند کیا جائے کہ وہ اپنی وہ تمام انفارمیشن ویب سائٹس پر رکھیں تاکہ ممبران دیکھ سکھیں۔

5۔ AGM کو شفاف بنانے کیلیے ہر کوآپریٹو سوسائٹی اے جی ایم کی مکمل ویڈیو رجسٹرار آفس میں جمع کرائے اور وہ ممبران کو بھی دستیاب ہو۔

6۔ ہر کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کو پابند کیا جائے کہ وہ ہر پلاٹ کی ٹرانزیکشن کو FBR کے سسٹم کے ساتھ منسلک کرے۔

7۔ ہر پراپرٹی ٹرانسفر اور سوسائٹی کے اہم فیصلوں کیلیے اخبارات کے ذریعے اشتہار کو لازمی قرار دیا جائے۔

8۔ ہر کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کو پابند کیا جائے کہ وہ اپنے تمام ریکارڈ کو کمپیوٹرائزڈ کریں۔

بلاگ کی ابتدا عام آدمی کے گھر بنانے کی خواہش سے ہوئی تھی، سندھ گورنمنٹ مندرجہ بالا تجاویز پر عمل کروا کر صوبے کے غریب عوام کی خدمت کر سکتی ہے لیکن اس کیلیے قانون کی برتری اور عوام کی خدمت کا جذبہ چاہیے۔

اس کے ساتھ ساتھ کوآپریٹو سوسائٹیز کے افسران سوسائٹی کے غریب ممبران کے ساتھ بھی کھلی کچہری کا انتظام کریں تاکہ سوسائٹی کے اصل حقائق معلوم ہو سکیں۔ قانون کی عملداری اور دی گئی تجاویز ہی واحد راستہ ہے جو لاکھوں سوسائٹی ممبران کو اُن کا حق دلا سکتے ہیں۔ اگر کوآپریٹو سوسائٹیز کے مسائل کیلیے یہ راستہ اختیار نہ کیا گیا تو پھر خدشہ یہ ہے کہ سندھ کی کوآپریٹو سوسائٹیز میں صرف لینڈ مافیا اور دولت مند طبقہ رہ جائے اور عوام کیلیے اپنی چھت ایک خواب ہی رہ جائے۔

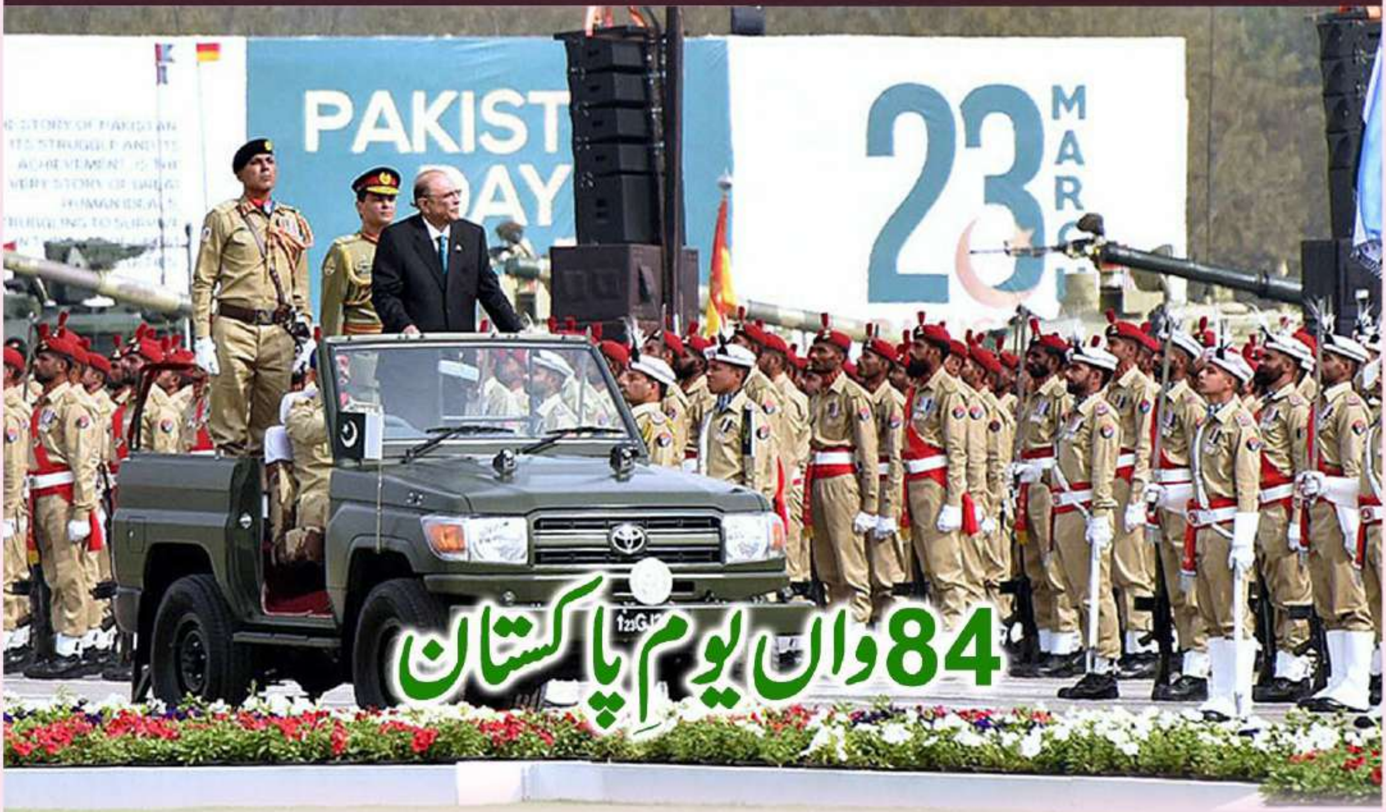


# 84واں یومِ پاکستان

پاکستان بھر میں یومِ پاکستان بھرپور ملی جوش و جذبے سے منایا گیا، اس موقع پر اسلام آباد میں مسلح افواج کے دستوں کی جانب سے شاندار پریڈ کا مظاہرہ کیا گیا، جبکہ جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی اور افواج پاکستان کے سربراہان نے بھی قوم کو مبارکباد دی۔

واضح رہے کہ یوم پاکستان 23 مارچ 1940 کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں منظور کی گئی قرارداد کی یاد میں منایا جاتا ہے، جس کی روشنی میں برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے لیے ایک علیحدہ وطن کا خواب دیکھا تھا۔

یہ قرارداد لاہور کے منٹو پارک میں پیش کی گئی تھی جہاں اس کی یادگار کے طور پر مینار پاکستان تعمیر کیا گیا۔

اسلام آباد شکر پڑیاں گراؤنڈ میں مسلح افواج کی پریڈ

یوم پاکستان کے موقع پر ملک بھر میں توپوں کی سلامی سے دن کا آغاز کیا گیا، مساجد میں وطن عزیز کی سلامتی اور ترقی وخوشحالی کی دعائیں کی گئیں۔

یوم پاکستان پر اسلام آباد میں مسلح افواج کی روایتی پریڈ کی جارہی ہے، تقریب کا آغاز قومی ترانے سے ہوا، مسلح افواج کے جوانوں کی مہارت کا شاندار مظاہرہ کیا، چین اور برادر پڑوسی ملک چین اور آذربائیجان کے فوجی دستے بھی پریڈ میں شامل ہیں۔

صبح سویرے اسلام آباد شکر پڑیاں کے پریڈ گراؤنڈ میں پاکستان رینجرز کے دستوں نے رینجرز اکیڈمی بینڈ ڈرل کا شاندار مظاہرہ کیا، ڈرل کے دوران رینجرز کے دستوں نے ذہنی وجسمانی صلاحیتوں کو شاندار انداز میں شرکا کے سامنے پیش کیا۔

آرمی اسکول آف میوزک کے دستے نے بھی سولو

ڈرم کا مظاہرہ کر کے دیکھنے والوں پر سحر طاری کر دیا۔

تقریب میں صدر پاکستان آصف علی زرداری، وزیراعظم شہباز شریف اور آرمی چیف سمیت ملکی وغیر ملکی شخصیات نے شرکت کی ہے۔

سعودی عرب کے وزیر دفاع شہزادہ خالد بن سلمان بن عبدالعزیز السعود پریڈ کے مہمان خصوصی تھے۔

دوسری جانب یوم پاکستان پر لاہور میں مزار اقبال پر تبدیلی گارڈز کی پروقار تقریب منعقد کی گئی، تقریب کے مہمان خصوصی ایئر وائس مارشل طارق محمود نے شرکت کی۔

پاک فضائیہ کے چاک وچوبند دستے نے مزار اقبال پر ذمہ داریاں سنبھال لیں، ستلج رینجرز کے دستے نے ذمہ داریاں پاک فضائیہ کے دستے کے حوالے کیں۔

مہمان خصوصی ایئر وائس مارشل طارق محمود نے مزار اقبال پر پھول چڑھائے، فاتحہ خوانی کی، ائیر وائس مارشل نے مہمانوں کی کتاب بھی تاثرات قلمبند کیے۔

مسلح افواج کے لڑاکا طیاروں کا شاندار فلائی پاسٹ

مسلح افواج کے لڑاکا طیاروں نے شاندار فلائی پاسٹ کیا، فلائی پاسٹ میں میراج لڑاکا طیارے، پاکستان کی پہچان جے ایف 17 تھنڈر شامل تھے، فلائی پاسٹ میں ونگ کمانڈر حسن صدیقی کی قیادت میں ایف 16 لڑاکا طیاروں نے شاندار مظاہرہ کیا۔

فلائی پاسٹ میں ایف 7 پی جی چیتا اور جے 10 سی، پاک فضائیہ کے ٹرانسپورٹ طیارے سی ون تھرٹی، جدید ترین جاسوسی نظام سے لیس طیاروں، پاک بحریہ کے اینٹی سب میرین لڑاکا طیاروں، پاک بحریہ کے اینٹی سب میرین لڑاکا طیاروں نے شاندار مظاہرہ پیش کیا۔

سیاسی جماعتوں سے گزارش ہے کہ مسائل کے حل کے لیے مل کر کام کریں، صدر

پریڈ کے موقع پر صدر مملکت آصف زرداری نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستانیوں کو یوم پاکستان کی مبارک باد دی اور کہا کہ عہد کرتے ہیں کہ پاکستان کی ترقی، سلامتی اور امن کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھیں گے، آج کا دن ہمارے لیے قومی اہمیت کا حامل ہے۔

انہوں نے کہا کہ سب کی ذمہ داری ہے کہ ملک کو درپیش مسائل سے نکالنے اور معاشی استحکام کے لیے مل کر کام کریں، پاکستان میں انتخابی عمل مکمل

# مفت راشن اسکیم؛ عوام کی عزت نفس کا بھی خیال کیجیے

شاہد کاظمی

پندرہ ارب کا راشن مکمل مفت دینے کے بجائے عوام کومہنگائی میں ریلیف دیجیے۔

آپ سے کوئی کہے کہ میں آپ کو مفت راشن دوں گا، لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کو قطار بھی بنانی پڑے گی، تصدیقی عمل سے بھی گزرنا پڑے گا، ہر مرحلے کی منظر کشی بھی ہوگی، اور یہ منظر کشی ہر سطح پر پیش بھی کی جائے گی متعلقہ افسران کو، اور شنید یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آپ کے راشن لینے کی تصویر میڈیا کی زینت بھی بن سکتی ہے۔

اگر کوئی پیشہ ور بھکاری ہے اور اسے محنت کی کبھی عادت ہی نہیں رہی ہو تو وہ یہ مرحلہ آسانی سے عبور کر جائے گا۔ لیکن آپ اگر سفید پوشی کا دامن تھامے ہوئے ہیں، آپ میں انا کا بت مکمل طور پر پاش نہیں ہوا، اور آپ کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ آپ کی مشکلات پر لوگ اپنی کارکردگی کی تصاویر بنائیں تو آپ اس مرحلے سے نہیں گزر پائیں گے، نہ گزرنا چاہیں گے۔ اس کے برعکس آپ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں ہوں گے جہاں سے ضروریات زندگی کچھ تھوڑے بہت پیسے دے کر ارزاں نرخوں پر آپ کو مل جائیں۔

بھلا ہو ان خیراتی پروگرامز کا، نام کے راشن پیکیجز کا کہ عوام کو ذلیل کرکے رکھ دیا ہے اور تشہیر اپنی کروائے جارہے ہیں۔ کہیں خبر دیکھی کہ عوام میں 15 ارب روپے کا رمضان راشن پروگرام وفاقی سطح پر لایا گیا ہے۔ صوبہ کیوں پیچھے رہتا، سننے کو ملا کہ 5 ارب کا پیکیج ہم بھی دیں گے۔ پھر نگہبان رمضان پیکیج آیا۔ نگہبانی تو کیا خاک کرنا تھی، اس پورے پیکیج یا رمضان میں تو یہ ہی تعین نہیں ہو پایا کہ کون حقدار ہے اور کون نہیں۔ رمضان کے پہلے کچھ دن عوام دھکے کھاتے رہے، لاٹھیاں سہتے رہے، بے ہوش ہوتے رہے۔ اس کے بعد خبر ملی کہ گھر گھر راشن کی تقسیم ہوگئی۔ ریونیو کا عملہ کبھی مصروف عمل ہے تو کبھی محکمہ صحت کے لوگ راشن بانٹنے کی ذمے داری سنبھالے ہوئے ہیں۔

ہر دفعہ تنقید ہوتی ہے کہ لکھنے والے کمروں میں بیٹھ کر لکھ دیتے ہیں، وہ عملی سطح پر اس پیکیج کی افادیت نہیں سمجھ سکتے، نہ اس کا انہیں اندازہ ہے۔ سوچا عملی سطح پر بھی جانچ کر لیتے ہیں۔ راولپنڈی کے ایک مضافاتی علاقے کی مقامی یونین کونسل کا رخ کیا (یونین کونسل کا ذکر اس لیے پردے میں رکھا کہ عملے کے افراد زیر عتاب نہ آجائیں)۔ گھر گھر راشن کی تقسیم اپنی دانست میں بہت اچھا فیصلہ ہوسکتا تھا اگر یہ واضح ہوسکتا کہ ضرورت مند افراد کا تعین کیسے کیا جائے گا۔ بے شک نادرا اور بینظیر انکم سپورٹ پروگرام سے مدد لی گئی لیکن ان دونوں ذریعوں میں معاملات کس قدر شفاف ہیں، اس بارے میں نیرو ابھی چین کی بانسری نہیں بجا رہا۔

مذکورہ یونین کونسل کے ڈسٹری بیوشن پوائنٹ پر عوام کی کثیر تعداد تو موجود تھی لیکن عملہ پریشان تھا۔ ان کے بقول وہ مقامی افراد کو پہچانتے بھی ہیں کہ ضرورت مند ہیں۔ لیکن ان کو فراہم کی گئی فہرست میں نہ ان کا نام ہے، نہ ہی ان کا کارڈ اسکین کا رزلٹ انہیں ضرورت مند ظاہر کر رہا ہے۔ لہٰذا ہم انہیں راشن نہیں دے پا رہے۔ لوگ ہیجان کا شکار کہ بھلا ہم سے زیادہ ضرورت مند علاقے میں کون ہے؟ علاقے کی مجموعی آبادی 5 سے 10 ہزار نفوس پر مشتمل ہے (مضافاتی گاؤں)۔ لیکن حیرانی ہوئی کہ بقول عملے کے صرف پانچ سے سات لوگوں کو راشن مل سکا۔ اب یہ ڈیجیٹل اپلی کیشن کا قصور ہے، نادرا ریکارڈ کا قصور ہے، یا پھر بینظیر انکم سپورٹ اسکیم کا؟ کوئی بتانے سے قاصر ہے۔ سونے پہ سہاگا صرف اندازہ لگانے کیلیے ایک ایسے سرکاری ملازم کا شناختی کارڈ اسکین رزلٹ کے مطابق نگہبان راشن لینے کا اہل ٹھہرا جن کے بقول ان کی تنخواہ ہی اچھی بھلی ہے اور انہوں نے تو صرف چیک کرنے کیلیے کارڈ دیا۔ ڈیٹا بیس مرتب کرنے والوں پر حیرت ہے۔

عملہ بے چارہ خود پریشان۔ ایک صاحب محکمہ صحت سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک مقامی صحت مرکز کے لیبارٹری اور انتظامی امور ان کے ذمے تھے۔ ان کے بقول اس ذمے داری کی وجہ سے انتہائی نازک حالات کے شکار مریض بھی صحت مرکز سے واپس جانے پر مجبور ہیں کہ میری غیر موجودگی میں صحت مرکز کا نظام بھی درہم برہم ہے۔ لیکن ہم یقینی طور پر ان امور کی طرف توجہ دینا گوارا نہیں کرتے۔

حیرت ہے کہ ہمارے منصوبہ ساز ترقیاتی اور فلاحی منصوبہ سازی میں کس رول ماڈل کو اپنا نصب العین بنائے بیٹھے ہیں کہ عوام کی مدد کے بجائے انہیں بھکاری بنانے پر پوری توجہ ہے۔ عوام کا ساتھ دینے کے بجائے انہیں بھکاریوں کی طرح مانگنے کی طرف راغب کیا جارہا ہے۔ الفاظ شاید سخت ہیں لیکن خدارا عملی طور پر معاملات دیکھیے۔ ایک جھگی میں رہنے والا بھی عزت کی طلب میں ہے۔ آپ تھیلے بانٹنے کے بجائے سستا آٹا مراکز بنا دیجیے۔ آپ راشن کی تمام اشیا ارزاں نرخوں پر دیجیے۔ عوام کو وہ عمل زیادہ پسند آئے گا۔ پندرہ ارب کا راشن آپ مکمل مفت دینے کے بجائے عوام کو سات ارب میں دیجیے۔ آپ اور کچھ نہ کرتے پیکیجز کے بجائے آپ یوٹیلٹی اسٹورز پر چیزوں کا معیار بہتر بنا دیتے لیکن آپ اوپن مارکیٹ میں موجود چینی اور یوٹیلٹی اسٹور پر موجود چینی کے معیار کا تقابل کیجیے تو حالات واضح ہوجائیں گے۔ ہر چیز آدھی قیمت پر دے دیجیے۔ عوام کو عزت سے سستی چیز دے دیجیے بجائے یہ کہ انہیں مانگنے والا اور بھکاری بناتے ہوئے مفت راشن کی لائنوں میں لگا دیں۔

خدارا! ملک کو ترقی دینے کے ساتھ اپنی سوچ کو بھی ترقی دیجیے۔ قوم کو بھکاری بنائیں گے تو بھکاری سوچ ہی ملک میں پروان چڑھے گی۔

ان اسکیموں پر عوام کے اربوں روپے خرچ کر دیے جاتے ہیں اور فائدہ عارضی ہوتا ہے۔

وطن عزیز پاکستان میں بدقسمتی سے جو حکومت آتی ہے وہ عارضی طور پر وقت گزاری کی پالیسی پر گامزن رہتی ہے۔ حکومت کی توجہ اپنی جماعت کو فروغ دینے پر مرکوز رہتی ہے اور اپنی اور جماعت کے رہنماؤں کی تشہیر کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔ حکومت ایسے پیکیج متعارف کرواتی ہے جو وقتی طور پر تو عوام کیلیے فائدہ مند نظر آئیں اور حکمران جماعت کی واہ واہ ہو جائے لیکن اس کے دیرپا نتائج نہیں ہوتے اور نہ ہی ملک و قوم کا مستقبل میں کوئی فائدہ ہوتا ہے۔ فائدہ ہوتا ہے تو صرف حکومت کو، جس کی وقتی طور پر ستائش ہوتی ہے اور ان کے چاہنے والے حکومت کے ریلیف پیکیج گن گن کر ان کے گُن گاتے پھرتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ یہ سب عارضی ہیں، جو دو دن چلنے کے بعد بند ہو جائیں گے اور عوام وہیں کے وہیں کھڑے ہوں گے جہاں اربوں روپے لٹانے سے پہلے کھڑے تھے۔

کوئی حکومت صحت کارڈ متعارف کراتی ہے، لنگر خانے کھولتی ہے تو کوئی حکومت مفت راشن تقسیم کرتی ہے۔ یوں عوام کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے اور اپنی محنت کے بل بوتے پر کمانے کے بجائے انہیں مفت کھانے کے عادی بناتے ہیں۔ ہماری حکومتیں اربوں روپے کے پیکیج متعارف کراتی ہیں یعنی ان پیکیجز میں اربوں روپے جھونک دیے جاتے ہیں اور عوام کو کیا ملتا ہے دس دن کا راشن یا عارضی کھانا و علاج۔ راشن زیادہ سے زیادہ کتنا چل جاتا ہے؟ پانچ دن یا دس دن، بس اس سے زیادہ تو نہیں چل سکتا۔ اس کے بعد وہی بھوک اور افلاس کے ڈیرے۔ اس میں حکومتیں ایک چالاکی یہ بھی کرتی ہیں کہ عوام کو مثلاً بیس ارب کا مفت علاج یا کوئی اور ریلیف پیکیج دیتی ہیں تو ساتھ ہی بجلی، گیس اور پٹرول وغیرہ کی قیمتوں میں اضافہ کر کے پچیس ارب روپے کا بوجھ عوام پر ڈال دیتی ہیں۔ یوں اس ریلیف پیکیج کی رقم منافع کے ساتھ دوسری طرف سے وصول کر لی جاتی ہے اور عوام کیلیے مسیحا بھی بن جاتے ہیں۔

یہ مسیحائی بھی فقط ان کے اپنے کارکنوں کیلیے ہوتی ہے کیونکہ دوسری جماعتوں کے کارکن تو کسی طرح ان کی تعریف نہیں کرتے۔ تحریک انصاف کی حکومت صحت کارڈ متعارف کراتی ہے تو مسلم لیگ ن والے اس کا مذاق اڑاتے ہیں، جبکہ پی ٹی آئی والے اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور اسے سراہتے ہیں۔ اسی طرح مسلم لیگ ن کی حکومت راشن تقسیم کرتی ہے تو ان کے اپنے کارکن تو اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیتے ہیں لیکن پی ٹی آئی والے اس پر تنقید کرتے ہیں۔ حالانکہ دونوں کا مقصد ایک، نقصان ایک، لیکن تعصب اور عدم شعور کی بنا پر ایسا کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک حکومت ایک پیکیج متعارف کراتی ہے تو دوسری آ کر اسے ختم کر کے نیا پیکیج متعارف کرا دیتی ہے۔ یوں فقط اپنی تشہیر کی خاطر عوام کے پیسے سے ہی عوام کا مذاق بنایا ہوا ہے۔

اگر عوام کو راشن دینے کے بجائے یہی رقم دو طرح سے استعمال کی جائے تو اس کا زیادہ فائدہ ہوگا۔ پہلا طریقہ تو یہ ہونا چاہیے کہ عوام کو مختلف چیزوں پر سبسڈی دی جائے، جن چیزوں کی قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ کیا جا رہا ہے ان کی قیمتیں کم کی جائیں۔ پٹرول، بجلی، گیس اور دیگر بنیادی ضرورت

کی اشیاء کی قیمتوں میں کمی کی جائے تاکہ عوام اس قابل ہو سکیں کہ اپنی کمائی سے خود ہی اپنی ضرورت کی اشیاء خرید سکیں، تو یہ زیادہ مفید ہوگا بجائے اس کے کہ عوام کو مفت مانگنے پر لگا دیا جائے۔ ایک طرف سے اشیاء مہنگی کر کے دوسری طرف سے انہیں مفت راشن وغیرہ دیا جائے۔ عوام کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور انہیں اپنی محنت سے کمانے کا عادی بنانا چاہیے لیکن محنت کا انہیں پورا صلہ بھی دیا جائے۔

دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ جو 60، 65 ارب روپے عوام کو مفت راشن دینے میں لگائے جا رہے ہیں اس کے بجائے اسی رقم سے فیکٹریاں لگائی جائیں تو عوام کو مستقل روزگار ملے گا۔ کئی افراد کو وہاں ملازمت ملے گی جس سے کئی خاندانوں کے معاش کا مسئلہ حل ہو جائے گا، کیونکہ ان کا مستقل ذریعہ معاش بن جائے گا۔ آپ نے مفت کے راشن پر جو 60، 65، 70 ارب روپے لگائے، وہ راشن اگر دو تین کروڑ لوگوں تک بھی پہنچتا ہے تو زیادہ سے زیادہ دس دن ہی چل پائے گا، اس کے بعد پھر وہی غربت، وہی افلاس۔ لہٰذا اس سے زیادہ بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ عوام کیلیے فیکٹریاں لگا دی جائیں تو اس سے عوام کیلیے مستقل معاش کا انتظام ہو جائے گا۔ اس سے ملک کا بھی فائدہ ہوگا اور ملک ترقی بھی کرے گا۔

آج دنیا صنعتوں سے ترقی کر رہی ہے، ملک تمام مصنوعات اپنے ملک میں تیار کر کے ملکی ضروریات بھی پوری کرتے ہیں اور برآمدات سے بھی کماتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں عوام کو لنگر خانے اور مفت راشن نہیں دیے جاتے بلکہ انہیں صنعتیں اور فیکٹریاں لگا کر دی جاتی ہیں، جن سے برآمدات میں اضافہ ہوتا ہے تو ملکی خزانہ بھرتا ہے، نتیجتاً عوام کو اچھی تنخواہیں دی جاتی ہیں، انہیں ان کی محنت کا پورا پورا صلہ ملتا ہے، ملک میں مہنگائی ختم ہوتی ہے۔ عوام اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ باآسانی اپنی ضروریات پوری کر سکیں اور خوشحال زندگی گزاریں۔

☆☆☆

# معاشرے کی اخلاقی پستی، ذمے دار کون؟

ضیاالرحمٰن ضیا

معاشرے کی درستی کیلیے ہر فرد کو اپنے احتساب کی ضرورت ہے۔

ہمارے معاشرے کا یہ رواج ہے کہ لوگ حکومت کو برا بھلا کہہ کر خود کو تمام تر اخلاقیات سے بری الذمہ سمجھ لیتے ہیں۔ جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے وفاقی وزرا سے لے کر ریڑھی والے تک ہر شخص اخلاقیات سے عاری ہے۔ ہر شخص کو اپنی فکر ہے، ہر ایک اپنے مفاد کیلیے دوسروں کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

عوام کے تمام طبقات میں کثیر تعداد میں مفاد پرست لوگ موجود ہ ہیں۔ جس معاشرے کی یہ حالت ہو کہ وہاں ہر شخص مفاد پرست، دھوکا دہی کو درست سمجھنے والا ہو تو وہاں نیک سیرت حکمرانوں کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے؟ حکمران بھی تبھی نیک ہوتے ہیں جب عوام نیک ہوں، کیونکہ حکمران عوام میں سے ہی آتے ہیں۔ دس چوروں کا سردار یقینی طور پر وہی بنے گا جو سب سے بڑا چور ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ چوروں کا سردار کوئی نیک شخص بن جائے گا۔ جن معاشروں میں حکمران انصاف پسند ہوتے ہیں، کرپشن سے دور رہنے والے ہوتے ہیں، ان معاشروں میں عوام کی بھی یہی روش ہوتی ہے۔

ہمارا طرز عمل یہ ہے کہ ہر معاملے میں حکومت کو برا بھلا کہہ کر خود ایسے بری الذمہ ہوجاتے ہیں جیسے ہمیں تو کسی قسم کی اخلاقیات کی ضرورت ہی نہیں۔

عوام میں ایسے افراد کثیر تعداد میں موجود ہیں جو موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لمبے لمبے ہاتھ مارنے سے گریز نہیں کرتے۔ حکمرانوں کو موقع زیادہ ملتا ہے یا ان کی رسائی زیادہ ہوتی ہے تو وہ زیادہ کرپشن کرتے ہیں لیکن اگر ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمیں جتنا موقع ملتا ہے اتنا ہم بھی کرتے ہیں۔ بس ہمیں

موقع ذرا کم ملتا ہے اور ہماری رسائی چھوٹی چھوٹی چیزوں تک ہے، اس لیے ہم خود کو پاک صاف سمجھ کر حکمرانوں کے سر ہر ایک گناہ ڈال دیتے ہیں۔

ٹھیک ہے حکومت بہت سے امور کی ذمے دار ہے لیکن عوام کی بھی تو کچھ ذمے داریاں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ عوام سب کچھ حکومت پر چھوڑ کر خود ہر ذمے داری سے بری ہوجائیں۔

یہ عوام ہی ہیں جو منافع خوری کے چکر میں دوسروں کو مصیبت میں ڈالے رکھتے ہیں۔ رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی پھل، سبزیاں اور دیگر اشیائے خور و نوش مہنگی ہوگئیں۔ کیا یہ سب بھی حکومت کے کہنے پر ہوا یا عوام نے خود ہی موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ایسا کیا ہے؟ یہاں ہر فرد ظالم ہے صرف حکومتوں سے کیا شکوہ کرنا؟

ہمارا تعلیمی نظام بھی اخلاقیات کے فقدان کا ذمے دار ہے۔ ہم بچوں کو پڑھاتے تو ہیں لیکن سکھاتے نہیں ہیں۔ بچے بس رٹے لگا کر امتحانات میں نمبر لینے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے علاوہ انہیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں؟ ہمیں اپنے تعلیمی اداروں میں اخلاقیات کا مضمون لازمی طور پر رکھنا ہوگا۔ اسلامیات کا مضمون تو ہے جس میں تھوڑا بہت اخلاقیات کا درس دیا جاتا ہے لیکن وہ بہت ناکافی ہے۔ کیونکہ ایک تو اسلامیات کی کتاب بہت ننھی سی ہوتی ہے، جو بہت سے مضامین کا احاطہ نہیں کرسکتی، اوپر سے بچے بلکہ اساتذہ بھی اسے آسان سی کتاب سمجھ کر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے۔ زیادہ توجہ دوسرے مضامین کی طرف دی جاتی ہے تاکہ امتحانات میں زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کیے جاسکیں۔ اس لیے اخلاقیات کے نام سے ایک باقاعدہ مضمون رکھنے اور اس میں معاشرتی آداب، دوسروں کا احساس وغیرہ سکھائے جائیں اور طلبا کو عملی طور پر مشق بھی کرائی جائے۔

ایسے ہی معاشرے کی درستی کیلیے ہر فرد کو اپنے احتساب کی ضرورت ہے۔ ہر شخص اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھے کہ وہ کتنا ایماندار ہے؟ دوسروں پر طعن و تشنیع کرنا آسان ہوتا ہے لیکن اپنے اندر کی غلطیوں کو ڈھونڈنا ذرا مشکل ہے۔ لہٰذا ہر فرد اپنی اصلاح کی فکر کرے۔ جب معاشرے کی غالب اکثریت درست ہوجائے گی تو حکمران بھی خود بخود ٹھیک ہوجائیں گے۔ جب ہر فرد اپنی اصلاح کی فکر کرے گا تو پھر کسی حاکم کو برا بھلا کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور معاشرہ امن و سکون کا گہوارہ بن جائے گا۔

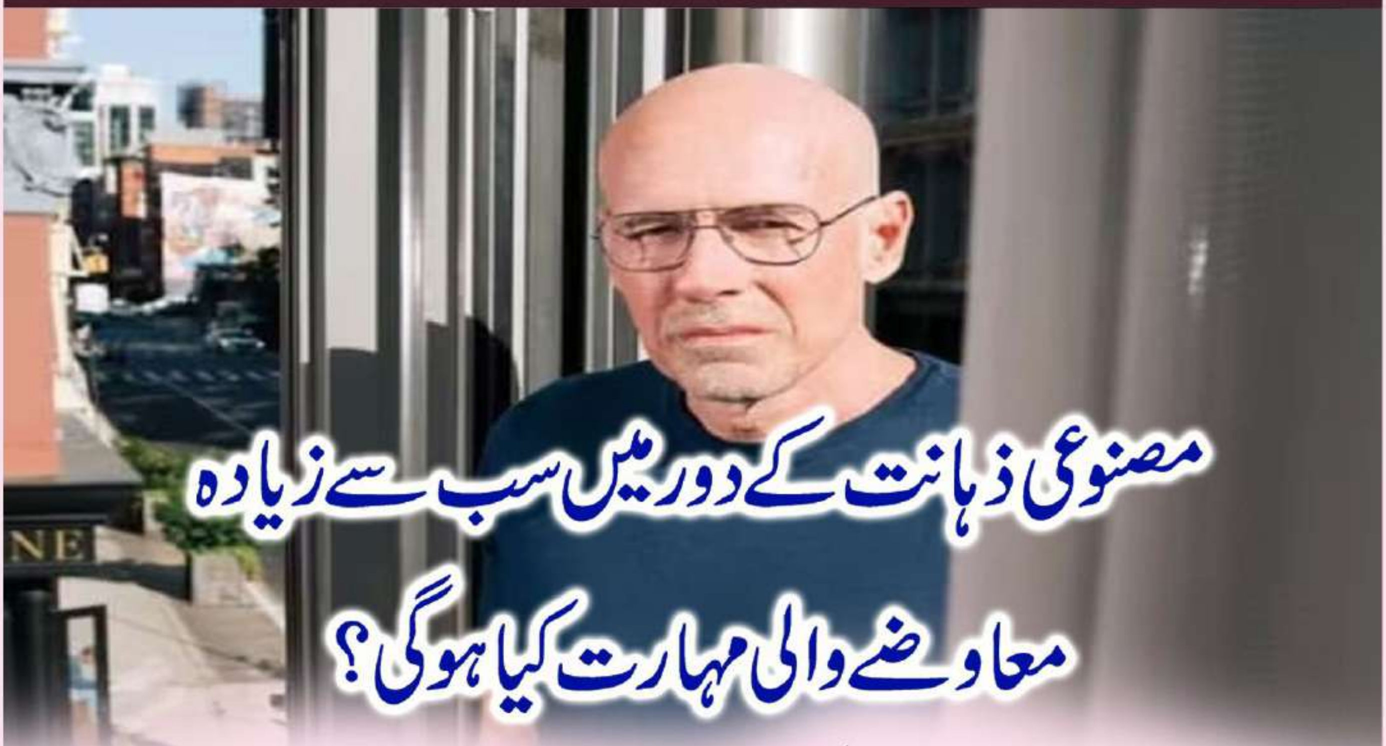

# مصنوعی ذہانت کے دور میں سب سے زیادہ معاوضے والی مہارت کیا ہوگی؟

آسٹن، ٹیکساس: ملازمتوں پر مصنوعی ذہانت کے بڑھتے اثرات کے باعث بہت سے افراد اپنے مستقبل کو محفوظ بنانے کی خاطر نئی مہارتیں سیکھنے پر

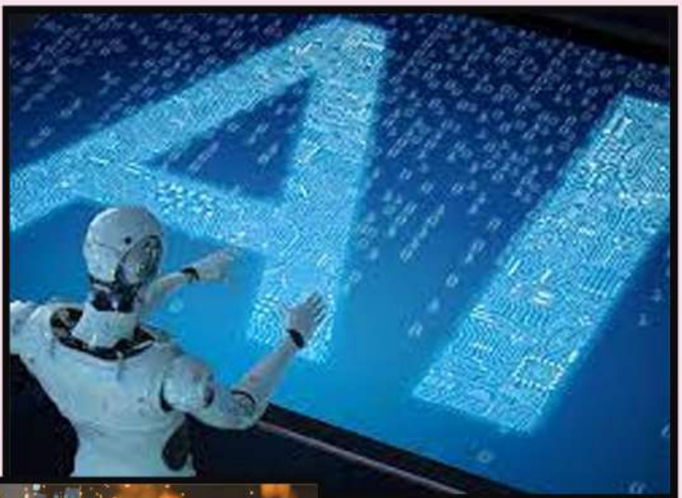


توجہ دے رہے ہیں۔

بہت سے لوگ ملازمت کے بہتر امکانات کے لیے کوڈنگ یا آرٹیفیشل انٹیلیجنس جیسی ٹیکنالوجیز سیکھنے کے حامی ہیں لیکن امریکی ارب پتی کاروباری شخصیت پروفیسر اسکاٹ گیلوے نے اپنے حالیہ انٹرویو میں نوجوانوں کو اسٹوری ٹیلنگ اسکل سیکھنے پر زور دیا ہے۔

نیویارک یونیورسٹی میں مارکیٹنگ پروفیسر کے طور پر اسکاٹ گیلوے یقین رکھتے ہیں کہ جب تک ٹیکنالوجی آگے بڑھے گی ڈیٹا کی مدد سے خیالات کو پہنچانے کی صلاحیت انمول ہوگی۔

اسکاٹ گیلوے نے چیٹ جی پی ٹی اور اے آئی جیسے ٹولز پر زیادہ انحصار کے خلاف خبردار کرتے ہوئے پیشہ ور افراد کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے متعلقہ شعبوں میں اپنے کام کا ماہر بننے پر توجہ دیں۔

بزنس مین اور پروفیسر نے کہا کہ اگر میں اپنے 13 اور 16 سالہ بچے کو کوئی قابلیت دے سکتا ہوں جس سے وہ میرے خیال میں وقت کی کسوٹی پر کھڑا ہو سکے گا تو وہ اسٹوری ٹیلنگ اسکل ہوگی۔

انہوں نے کہا کہ اسٹوری ٹیلنگ کی قسم طے نہیں ہو سکتی کیونکہ مواصلاتی پلیٹ فارم مسلسل تیار ہو رہے ہیں، جو چیز واقعی اہم ہے وہ اچھی طرح سے لکھنے، خیالات کو بیان کرنے، ڈیٹا، انفوگرافکس، سلائیڈ شوز کے ساتھ خیالات پیش کرنے کی صلاحیت ہے۔

قبل ازیں فوربس میگزین نے کہا تھا کہ اس سال ڈیٹا کمیونیکیشن اور ڈیٹا اسٹوری ٹیلنگ دو ایسی اہم مہارتیں ہوں گی جس کی مارکیٹ میں بہت زیادہ مانگ ہوگی۔

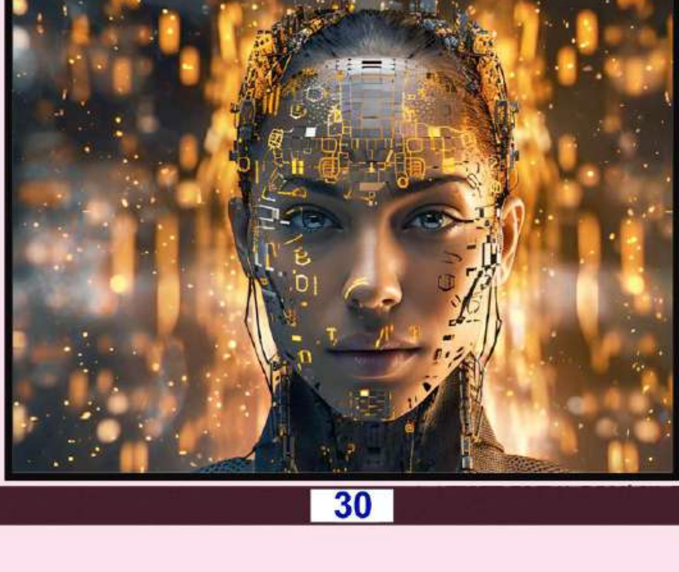

ایک اندازے کے مطابق 2025 میں 70 فیصد نوکریاں براہ راست ڈیٹا سائنس کے ساتھ جڑی ہوئی ہوں گی، آپ کے ہتھیاروں میں سب سے طاقتور ٹولز میں سے ایک ڈیٹا ہے۔

ڈیٹا اسٹوری ٹیلنگ کے ذریعے آپ پیچیدہ موضوعات کو اس انداز میں پیش کر سکتے ہیں جس کے لیے زیادہ تکنیکی علم کی ضرورت نہیں ہے۔

جدید ٹولز اور تکنیکوں کا استعمال کرتے ہوئے آپ متعلقہ معلومات کا جائزہ لے سکتے ہیں، ڈیٹا کے رجحانات کی مدد سے درست کاروباری فیصلوں میں بھی مدد ملتی ہے۔